Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.74, 2009, pp 7 - 80

تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جنوری۔ مارچ، شمارہ ۷۴، ۲۰۰۹ء

''گذشتہ لکھنؤ'' کی تازہ اشاعت مرتّبہ محمد اکرام چغتائی

(ایک جائزہ)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی☆

Abstract:

Maulana Abdul Halim Sharar(1860 - 1926 A.D) was a great literary figure of the sub-continent in 20th century. He wrote prolifically on different subject. Besides biographies and historical and imaginary novels, he also wrote on history, culture, drama and poetry. "The Last Model of Oriental Culture in India" which is also commonly known as Guzashta Lucknow, is 8th chapter of the compilation namely Mazamin-e Sharar. As "Guzashta Lucknow" presents the real picture of the then Lucknow, it has got special attention of publishers, compilers and the readers. Many people have compiled the book. This article is a critical study of the current compilation of the book by Muhammad Ikram Chugtai. The compiler could not do justice with his work as it lacks in many ways and this has been proved in the paper.

مولانا عبدالحلیم شرر(۱۸۶۰ -۱۹۲۶ء) کا نام ہماری ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔اُن کا شمار اُردو کے زُود نویس مصنّفین میں ہوتا ہے ۔اُن کی قلمی یادگاروں کی تعداد سو سے اوپر ہی ہوگی، جن کے نمایاں موضوعات سوانح عمریاں' تاریخی اور تخیلاتی ناول' تاریخ وتہذیب'

☆ وزیٹنگ پروفیسر شعبہ فارسی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ڈرامہ اورشاعری ہیں۔علاوہ ازیں اُن کی ادارت میں متعدد رسالے شائع ہوئے، جن میں ماہنامہ ''دلگداز'' سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔اِن رسائل میں شامل ہونے والے بہت سے مضامین'مصنف کی نظر ثانی کے بعد' کئی جلدوں میں سیّد مبارک علی شاہ گیلانی کے اہتمام سے لاہور سے شائع ہوئے۔عنوان تھا''مضامینِ شرر''۔اِن سب پر خود مولانا نے نظر ثانی کی تھی۔اِس سلسلے کی آٹھویں جلد''ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ'' ہے جو''گذشتہ لکھنؤ'' کی عرفیت سے معروف ہے۔اِس پر سنہ اشاعت درج نہیں تاہم یہ شرر کی زندگی کے آخری برسوں کا واقعہ ہے۔اِس سے قبل یہ ماہنامہ ''دلگداز'' میں سنہ ۱۹۱۳ء سے (غالباً) ۱۹۲۰ء تک قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔شرر کی تصانیف میں ''گذشتہ لکھنؤ'' ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے۔اِس کے بارے میں رشید حسن خان نے صحیح لکھا ہے کہ:

''اِس کتاب میں تاریخ' ناول' افسانے' انشائیے اور کہانی کے عناصر اِس طرح آمیز ہو گئے ہیں کہ اِن کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔اِس میں جو مرقّع سجائے گئے ہیں' اُن میں سے کئی مرقّع سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور کئی منظر متحرک نظر آتے ہیں''۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ شرر نے یہ تمام مناظر اپنے بچپن اور لڑکپن میں پہلے لکھنؤ اور پھر مٹیا برج کے احاطے میں دیکھے تھے۔اِس حقیقت کے پیشِ نظر ''گذشتہ لکھنؤ'' شُنیدہ کے بُود مانند دیدہ کی عمدہ مثال بن گئی ہے۔لاہور والی اشاعت کے بعد اپنی مقبولیت کے باعث یہ کتاب بار بار شائع کی گئی۔اُن میں بعض اہم اشاعتیں یہ ہیں:

- وِرلڈ اردو سنٹر' کراچی ۱۹۵۶ء مقدمہ از غضنفر امروہوی
- مکتبۂ کلیان' لکھنؤ غالباً ۱۹۶۰ء باہتمام شمیم انہونوی
- نسیم بکڈپو' لکھنؤ ۱۹۶۵ء مرتبہ شمیم انہونوی مع تعارفی نوٹ
- مکتبۂ جامعہ' دہلی (بسلسلہ معیاری ادب) ۱۹۷۱ء مرتبہ رشید حسن خان مع تعارف

معیاری ادب کا یہ سلسلہ مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں و کشمیر کے اشتراک سے شروع

کیا تھا جس کا مقصد اردو زبان کی معیاری کتابوں کی تصحیح کے بعد اُن کے سستے ایڈیشن شائع کرنا تھا تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دسترس میں آسکیں۔اِس سلسلے کے تحت چھپنے والی کتابوں میں "گذشتہ لکھنؤ" کا نمبر شمار ۴۰ تھا۔

بظاہر رشید حسن خان کی تصحیح و ترتیب کے بعد کسی نئی اشاعت کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب نے یہ کام بوجوہ عجلت اور روا روی میں انجام دیا تھا۔ یوں بھی یہ ایڈیشن خواص کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں اور بالخصوص طالب علموں کے لیے نکالا جا رہا تھا۔اِس میں خان صاحب نے بڑا کام یہ کیا کہ پہلی بار "گذشتہ لکھنؤ" کے موضوعات کی ایک جامع فہرست تیار کر کے شاملِ اشاعت کر دی۔حواشی اور فرہنگ کے لیے وہ وقت نہ نکال سکے۔متن کی پاورقی میں وہی چند مختصر حاشیے ملتے ہیں جو مصنف نے بعض صراحتوں کی غرض سے دیے تھے بلکہ جہاں مصنف سے کوئی لفظ چھوٹ گیا تھا یا جملے کی ساخت میں سقم تھا وہاں مرتّب نے تصحیح کرنے کی بجائے "کذا" لکھنے پر اکتفا کی۔

■ مکتبہ ُجامعہ' نیو دہلی جولائی ۲۰۰۰ء مرتبہ رشید حسن خان (اشاعتِ ثانی)

یہ ۱۹۷۱ء والے ایڈیشن مرتبہٗ رشید حسن خان کی دوسری اشاعت ہے۔انتیس برس کے اِس درمیانی عرصے میں'جو خاصا طویل ہے'ناشرین کو چاہیے تھا کہ وہ خان صاحب موصوف سے اِس پر نظرِ ثانی کی درخواست کرتے۔افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔"باغ و بہار" کی مثال ہمارے سامنے ہے۔رشید حسن خان نے معیاری ادب کے سلسلے میں اِس کو بھی مرتّب کیا تھا اور یہ مکتبہ جامعہ ہی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کی تھی تاہم خان صاحب اِس سے مطمئن نہ تھے۔چنانچہ ایک طویل عرصے کے بعد اُنہوں نے از خود اِس کو دوبارہ مرتّب کیا جس کا شمار اُردو میں تدوین کے بہترین نمونوں میں ہوتا ہے۔

یہاں اِس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ رشید حسن خان صاحب والی پہلی اشاعت سے چند سال بعد "گذشتہ لکھنؤ" کا انگریزی ترجمہ

"LUCKNOW:THE LAST PHASE OF AN ORIENTAL CULTURE"

کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۹۷۴ء میں ساہتیہ اکیڈمی اور یونیسکو کے تعاون سے ای۔ ایس۔ ہارکورٹ (E.S.HARCOURT) اور فاخر حسین نے مشترک طور پر کیا تھا جو لندن سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اِس ترجمے کے شروع میں تعارفی مضامین اور آخر میں حواشی، کتابیات اور اشاریہ شامل ہیں۔

اب ''گذشتہ لکھنؤ'' کی وہ تازہ اشاعت منصۂ شہود پر آتی ہے جس کی تدوین کے فرائض ہمارے معروف محقق محمد اکرام چغتائی صاحب نے انجام دیے ہیں اور جسے سنگِ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے سنہ ۲۰۰۶ء میں شائع کیا ہے۔ کتاب اور مصنف کے نام کے بعد درج ذیل تفصیل ہے:

''ترتیب نو مع حواشی، اضافات و فرہنگ محمد اکرام چغتائی''

یہ اشاعت مجموعی طور پر ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

دیباچہ	از محمد اکرام چغتائی (مرتب)	ص ۱۱ تا ص ۱۸
مقدمہ	ڈاکٹر سلیم اختر	ص ۱۹ تا ص ۵۱
متن		ص ۵۳ تا ص ۳۲۱
حواشی		ص ۳۲۳ تا ص ۳۶۶

گذشتہ لکھنؤ (تنقیدی و تحقیقی جائزہ)

تعارف	از رشید حسن خان	اشاعت مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	ص ۳۶۷ تا ص ۳۸۴
مقدمہ	از غضنفر امروہوی	اشاعت ورلڈ اردو سنٹر، کراچی	ص ۳۸۵ تا ص ۴۱۳
مقدمہ	از شمیم انہونوی	اشاعت نسیم بکڈپو، لکھنؤ	ص ۴۱۴ تا ص ۴۱۶

عبدالحلیم شرر (سوانح حیات اور عمومی جائزہ)

''مولانا عبدالحلیم شرر'' از مولانا بشیر الدین (روزنامہ ''زمیندار''، لاہور ۳۰ جنوری ۱۹۲۷ء)

ص ۴۱۷ تا ص ۴۳۲

''مولانا شرر مرحوم'' از خواجہ عبدالرؤف عشرت (''زمانہ'' کانپور فروری ۱۹۲۷ء)
ص۴۲۳ تا ص۴۲۸
''عبدالحلیم شرر'' از ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (''عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر''
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی) ص۴۲۹ تا ص۴۵۷
''عبدالحلیم شرر'' از پروفیسر جعفر رضا (''عبدالحلیم شرر'' ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی)
ص۴۵۸ تا ص۴۸۴
''عبدالحلیم شرر کے
حالات زندگی
اور تصنیفات'' از ڈاکٹر ممتاز منگلوری (''شرر کے تاریخی ناول اور
اُن کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' خیابانِ ادب لاہور ۱۹۷۸ء)
فرہنگ ۴۸۵ تا ص۵۰۲ ص۴۸۵ تا ص۴۹۴
"LUCKNOW :THE LAST PHASE INTRODUCTION OF AN ORIENTAL CULTURE" Paul Elek,London,1975 ص۵۰۳ تا ص۵۱۹

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ میں مجلسی رشید حسن خان کی مرتبہ ''گذشتہ لکھنؤ'' سے مطمئن نہ تھا اِس لئے جب اکرام چغتائی صاحب کی مرتّب کردہ تازہ اشاعت کا علم ہوا تو اِس سے مجھے یک گونہ مسرّت ہوئی ۔لیکن جب میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اِس کا مطالعہ کیا تو ساری خوشی کافور ہو گئی بلکہ میں ایک سناٹے میں آ گیا۔فاضل مرتّب نے اِس اہم کام میں جس بے نیازی بلکہ غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے اُس کی توقع تحقیق و تدوین کے ایک مبتدی طالب علم سے بھی نہیں کی جا سکتی۔نتیجہ یہ کہ زیرِ نظر اشاعت میں قاری کا واسطہ جن فروگزاشتوں، تسامحات اور اغلاط سے پڑتا ہے اُن کا مبسوط تذکرہ تو درکنار، اُنہیں حیطۂ شمار میں لانا بھی من قبیلِ

محالات ہے۔جس کا سبب یہ ہے کہ اکثر غلطیاں بسیط ہی نہیں مرکّب بھی ہیں ۔میری یہ رائے بظاہر درشت معلوم ہوتی ہے تاہم اِس میں مبالغے کا شائبہ تک نہیں ۔

چغتائی صاحب کے کام کا مجمل جائزہ چیدہ مثالوں کے ساتھ ذیل میں پیش ہے۔تفہیم وتفہّم میں سہولت کی خاطر یہ جائزہ اِن آٹھ نکات کی روشنی میں لیا جانا مناسب ہوگا جو مرتّب نے اپنے کام کی امتیازی خصوصیات کے طور پر دیباچے میں گنوائے ہیں ۔

(۱)

''ابتداً گذشتہ لکھنؤ شرر ہی کے مجلّہ ''دلگداز''میں بالاقساط شائع ہوئی اور پھر اِن تمام قسطوں کو یکجا کر کے اِسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔زیرِ نظر ایڈیشن میں اُن دونوں طباعتوں کے متن کو بنیاد بنایا گیا ہے اور کہیں کہیں جناب رشید حسن خان کے مرتّبہ متن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔''

چغتائی صاحب کا یہ دعویٰ کہ زیرِ نظر اشاعت میں ''دلگداز'' کے متعلقہ شماروں اور ''گذشتہ لکھنؤ'' کی پہلی اشاعت (بسلسلہ مضامینِ شرر،مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور باہتمام سیّد مبارک شاہ گیلانی)دونوں کے متن کو بنیاد بنایا گیا ہے،محلِ تامّل ہے۔جہاں تک مجھے علم ہے''دلگداز'' کا مکمل فائل برِّعظیم کے کسی اہم مجموعۂ کتب میں محفوظ نہیں ہے۔حد یہ ہے کہ کوئی صاحب وثوق سے نہیں بتا سکتے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' کی آخری قسط ''دلگداز'' کے کون سے شمارے میں چھپی تھی۔اگر بالفرض چغتائی صاحب نے یورپ کی کسی لائبریری میں یہ فائل دیکھا تھا تو اُنھیں اُس کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔علاوہ ازیں جب لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل،خود مصنف نے اِس پر نظرِ ثانی کر لی تھی تو گویا ''دلگداز'' والی قسطیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگئیں۔اب اُن کو بنیاد بنانے کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ہاں اختلافِ متن دکھانے کے کام آسکتی تھیں لیکن مرتّب نے اِن دونوں متون کے اختلاف کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا،پھر اُن کا یہ دعویٰ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے؟باقی رہا یہ اعتراف کہ ''کہیں کہیں رشید حسن خان کے مرتّبہ

متن سے استفادہ کیا گیا ہے" سو مجھے تو یہ ادعا بھی اضافت بادنیٰ ملابست ہی نظر آتی ہے۔

(الف) حقیقت یہ ہے کہ ترتیبِ متن کے شعبے میں بنیادی کام تصحیحِ متن کا ہوتا ہے باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ۔ "گذشتہ لکھنؤ" کی اتنی اشاعتوں کے باوجود اگر چغتائی صاحب نے اِس کی تدوین کا بیڑا اُٹھایا تھا تو اس کا حق ادا کرتے۔ یہ کیا کہ لاہور والی پہلی اشاعت سے لے کر چغتائی صاحب والے ایڈیشن تک کے متون میں کسی بہتری کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ نقل در نقل کا ایک سلسلہ ہے اور بس۔ جو الفاظ پہلی اشاعت میں غلط چھپ گئے تھے وہ اِس میں بھی درستی کے محتاج نظر آتے ہیں ۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرتا ہوں :

[redacted] گھیتلا جوتا اور گھیتلی جوتی، سپاٹ تلے اور مڑی ہوئی لمبی نوک والی پاپوش ہے جو اگلے زمانے میں کثرت سے رائج تھی۔ مرتبہ چغتائی صاحب میں (صفحہ ۲۴۵ پر) باقاعدہ ذیلی عنوان ہے "گھتیلا"۔ اِس صفحے پر یہ لفظ گھتیلا اور گھتیلے کی صورت میں سات بار آیا ہے اور ہر بار غلط۔ آیندہ صفحے پر پھر چار بار لایا گیا ہے۔ میں نے اِسے حروف چین کی غلطی سمجھ کر رشید حسن خاں والا ایڈیشن دیکھا تو وہاں بھی غلط۔ کراچی والی اشاعت سے رجوع کیا تو وہی صورت تھی۔ بالآخر انگریزی ترجمے کو ٹٹولا تو بدستور ghatela کی تکرار پائی۔ غرض آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

میں یہاں محمد شاہ (۱۷۱۹۔۱۷۴۸ء) کے عہد میں جوتی فروشوں کے فساد پر اردو کے قدیم شاعر بے نوا سنامی کے مخمس کا ایک بند درج کرتا ہوں جس سے زیر بحث لفظ کا تلفظ معلوم ہو سکے گا:

جوتی فروش بیچ پڑی آ کے کھلبلی
کیتوں کے کئے ڈھیلے ہوئے اور عقل ٹلی
بے حد شمار مرحلے سے جوتیاں چلی
کیا نئی کیا پرانی، گنوارو و گھیتلی
لاہوری، سیف خانی، چرن مندہ، بھتہ دار

■ چغتائی صاحب کے مرتبے میں ایک سے زائد مقامات پر لفظ ''بُٹنا'' آیا ہے مثلاً صفحہ ۲۸۳ پر اِس فقرے میں: ''اُس وقت سے روز اُس کے بُٹنا لگتا ہے''۔اِس سے پہلے کی تمام اشاعتوں میں یہ لفظ اِسی طرح درج ہے حتیٰ کہ انگریزی مترجم بھی BUTNA (P.206) لکھ رہا ہے۔

اردو کتبِ لغات میں بُٹنا کو اُبٹن کا مخفف بتایا گیا ہے بلکہ اِس کی تانیث بٹنی بھی آتی تھی تاہم گذشتہ ایک صدی سے یہ لفظ متروک ہو گیا ہے۔اب اِس کی جگہ ابٹن اور ابٹنا نے لے لی ہے البتہ اِس کا چلن ہندوؤں میں اور نیم خواندہ طبقوں میں خال خال ملتا ہے یا پھر ضرورتِ شعری کے تحت لایا جاتا ہے۔'' بُٹنا '' تلفظ کی مخالفت ''گذشتہ لکھنؤ'' کی تالیف سے ایک صدی پہلے لکھنؤ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔انشا کا شعر ذیل میرے موقف کی تائید کرتا ہے:

بُٹنا گوڑا کہنا بھی کچھ لفظ ہے بھلا
ہم تو یہی کہیں گے اجی اُبٹنے کی باس

اِس بات کا احتمال ہے کہ مصنف نے ابٹنا لکھا ہو اور پہلا الف کتابت میں چُھوٹ گیا ہو۔بہر حال مرتب کو اس پر حاشیہ دینا چاہیے تھا۔

■ نئے ایڈیشن میں صفحہ ۲۳۵ پر ایک ذیلی عنوان ہے:''کلاہ پاپاں (ایرانی ٹوپی)''۔یہ پڑھ کر میں ٹپٹایا۔رشید حسن خاں والی اشاعت کی فہرست میں دیکھا تو وہاں ''کلاہ پاپاں'' درج تھا۔دھیان ''کلاہ پاپاخ'' کی طرف جاتا تھا لیکن ثبوت کی جستجو تھی۔بالآخر خود مصنف کی تحریر سے یہ عقدہ وا ہوا۔اِسی عنوان کے ذیل میں یہ فقرہ نظر پڑا:

''.....خیال ہوا کہ بجائے ترکی ٹوپی کے دربارِ عجم کی کلاہِ پاپاخ کو اپنے لیے اختیار کریں۔''

■ صفحہ ۸۸ پر ایک اور ذیلی عنوان ہے ''بادشاہ کی زمانہ مزاجی''۔یہ نصیر الدین حیدر کا

تذکرہ تھا۔عنوان پلّے نہ پڑا۔آخر ذرا آگے چل کر پتہ چلا کہ ''زمانہ مزاجی ''مراد ہے۔دراصل کتابت کی چھوٹی موٹی غلطیاں تو درگزور کے قابل ہوتی ہیں لیکن عنوانات کی اغلاط کی براہ راست ذمّہ داری مرتب پر عائد ہوتی ہے۔

■ صفحہ ۱۰۶ پر پرندوں کے ذکر میں ایک پرندہ ''کشوری'' ملتا ہے:

''اِس میں شتر مرغ، کشوری، فیل مرغ، سارس، تازیں، بگلے، قرقرے، ہنس، مور، چکور، اورصد ہاقسم کے طیوراور کچھوے چھوڑے گئے تھے۔''

کشوری نام کا کوئی پرندہ نہیں ہوتا لیکن چغتائی صاحب بھی کیا کریں شروع سے تمام اشاعتوں میں ''کشوری'' ہی لکھا ہوا ملتا ہے۔ انگریزی مترجمین ترجمہ کرتے ہوئے اِس مُہمل لفظ سے دامن بچا کر نکل گئے۔دراصل یہ پرندہ ''کستورا'' ہے جو ایک خوش الحان چڑیا کا نام ہے۔شرر نے یہاں ''کستورے''استعمال کیا ہوگا۔اُن دنوں چھوٹی اور بڑی دے، لکھنے میں امتیازنہیں کیا جاتا تھا۔لہذا کستوری بنا اور کتابت میں کشوری کی جون اختیار کر گیا۔پھر'سچ کہتے ہیں بلّی تو بلّی ہی سہی' کے مصداق یہی صورت مسلّمہ قرار پائی۔

■ متن کے صفحہ ۱۰۷ پر یہ عبارت ملتی ہے:

''اِس پہاڑ کے نیچے بھی دوکٹہرے تھے جن میں دو بڑی بڑی چتّیں رکھی گئی تھیں ۔یوں تو خاموش پڑی رہتیں لیکن جس وقت مرغ لا کر چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلّم نگل جاتیں۔''

لفظ ''چتّیں ''پرحاشیہ درکار تھا لیکن چغتائی صاحب کنّی کترا گئے۔''چیت''بڑے سانپ یعنی اژدھے کو کہتے ہیں جو انگریزی میں PYTHON کہلاتا ہے۔''چیت'' کی وجہ تسمیہ یہ کہ اُس پر چتّیاں بڑی ہوتی ہیں ۔اِسی بنا پر گُلدار کو چیتا اور چتّوں والے ہرن کو چیتل کہاجاتا ہے۔''چیت'' مونث ہے اِس لیے اِس کی جمع چتّیں آتی ہے۔چغتائی صاحب اِسے شاید نہیں یقیناً چیتے کی مادہ سمجھے۔انگریزی مترجمین کو بھی یہی دھوکا ہوا تھا۔ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

"Below this hill were two cages in which there were two large leopards.

Normally they lay quiet but if a fowl was given to them they would spring on it and gobble it up whole."(p.73)

سامنے کی بات ہے کہ چیتا اپنے شکار کو کبھی سموچا نہیں نگلتا۔ چلیے یہ نہ سہی اگر متذکرہ بالا عبارت کا اگلا فقرہ بغور دیکھ لیا جاتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ فقرہ یہ ہے:

"سانپوں کو رکھنے کا انتظام اِس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہو گا اور یہ خاص واجد علی شاہ کی ایجاد تھی۔" (صفحہ ۱۰۷)

■ صفحہ ۱۷۱۔ پر لوے پکڑنے کی ترکیب بتاتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا:

"......اُس کے مہنگو پر جھلّی منڈھ کے ایک سینگ میں ڈورا باندھ کے اُس سینگ کو جھلّی میں چھو کے اندر اٹکا دیتے ہیں اور اُس ڈورے کو ہاتھ سے سونتا شروع کرتے ہیں ......الخ"

یہ پڑھ کر مجھے تعجب ہوا جھلّی کی کیا بساط ہے کہ اُس میں سینگ اٹکایا جا سکے۔ یقیناً مصنف کی مراد "سِینک" سے ہے جو جھاڑو وغیرہ کے خشک تنکے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ امیر خسرو سے منسوب اِس مصرع میں استعمال ہوا ہے:

اوروں کے جاں سِینک سمائے چُھو کے واں موصل

دراصل "گذشتہ لکھنؤ" کی اکثر پرانی اشاعتوں میں سینگ لکھا گیا ہے اِس لیے چغتائی صاحب نے بھی اِس کو جوں کا توں رہنے دیا۔

اِن مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

(ب) ایک مصحح متن کا فرض ہے کہ وہ ایسے متن کی تعیین کرے جو مصنف لکھنا چاہتا تھا، نہ اُس کا جو اُس نے لکھا تھا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف سے بھی تحریر میں بھول چُوک ہو سکتی ہے۔ رشید حسن خاں نے مخصوص حالات کے باعث یہ فریضہ انجام نہیں دیا تھا البتہ اُنہیں اِس بات کا احساس ضرور تھا چنانچہ لکھتے ہیں:

"اِس میں ایک دو مقامات پر ایسی غلطیاں بھی ہیں جن سے مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔

ایسے مقامات پر قوسین میں ''کذا'' لکھ دیا گیا ہے۔'' (صفحہ ۳۴ تعارف)

چغتائی صاحب کے ہاں ''کذا'' کے حامل مقامات رشید حسن خاں سے زیادہ ہیں۔ اُنھیں چاہیے تھا کہ اِن مقامات پر عبارتوں میں معمولی ردّ و بدل کر کے یا دو ایک الفاظ بڑھا کے اِن کا سقم دور کر دیتے اور پاورقی میں اِس تبدیلی کا اظہار کر دیتے مثلاً:

''اُنھی دنوں پیر خاں نے ......اِن سب محلّوں سے مغرب کی طرف دور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام (کذا) آج تک پیر خان کی گڑھی کہلاتا ہے۔'' (صفحہ ۶۵)

یہ عبارت لکھنؤ کے محاورے کی رُو سے بالکل درست ہے اور اِس میں ''کذا'' کا کوئی موقع نہیں۔

■ کتاب کے صفحہ ۹۹ پر واجد علی شاہ کی معزولی کے ضمن میں کمپنی کے احکام پر مبنی یہ عبارت ملتی ہے:

''آپ کا ملک انگریزی ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ ماہوار جو آپ کی اور وابستگانِ دامن کی ضرورتوں کے لیے بخوبی کافی ہے مقرر کی گئی (کذا)......''

فاضل مرتّب کو چاہیے تھا کہ لفظ ماہوار کے بعد قلابین میں [کی رقم] کا اضافہ کر دیتے اور اِس عبارت کو ''کذا'' کی سولی سے اتار لیتے۔ ''تین لاکھ روپیہ سالانہ ماہوار'' میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ اِس سے مراد ہے کہ تین لاکھ روپیہ سالانہ ماہوار قسطوں میں ادا کیا جائے گا یعنی مبلغ پچیس ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے۔

■ صفحہ ۲۲۷ پر جامہ کے تعارف کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''اِس لباس میں نیچے سے مراد کہنیوں تک کی آدھی آستیوں کا شلوکا تھا اور سینے پر اُس میں گھنڈیاں لگائی جاتیں (کذا)......''۔

اِس عبارت کے آخری حصّے میں ذرا سی تبدیلی کر کے ''کذا'' سے بچا جا سکتا تھا یعنی

یوں:

"اور اُس میں سینے پر سامنے گھنڈیاں لگائی جاتیں۔"

- "خلفائے اربعہ کی مخالفت اور پنجتن کی محبت نے لکھنؤ کی درباری معاشرت نے (کذا) چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا"۔(صفحہ ۲۴۲)

یہاں " محبت نے" اور "معاشرت نے" میں سے کسی ایک کے "نے" کو اگر "میں" "بنا دیا جاتا تو "کذا" سے بے نیاز ہوا جا سکتا تھا۔

- سلفچی کے بارے میں لکھا ہے:

"اس میں بہت بڑی خوبی اور نفاست یہ ہے کہ میلا پانی، جس کی صورت کریہہ ہوتی ہے، نظر کے سامنے نہیں رہتا اور جن کے مزاج میں نفاست ہے اُن کو تکلیف ہوتی ہے (کذا)....."(صفحہ ۲۱۱)

یہاں صرف ایک لفظ کی تبدیلی درکار تھی یعنی "اور جن کے مزاج" کے "اور" کی جگہ "ورنہ" درج کر دیا جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ابتدائی ایڈیشن میں "ورنہ" کی جگہ کاتب کی غلطی سے "اور" لکھ دیا گیا ہو اور پھر یہ غلطی یونہی نقل در نقل چلی آئی ہو۔

(ج) عجلت یا غفلت کے باعث بعض اوقات مصنف کوئی بات ادھوری یا کوئی مطلب تشنہ چھوڑ جاتا ہے۔مرتب کے لیے لازم ہے کہ وہ اُن مقامات پر قارئین کی تشنگی دور کرنے کا سامان مہیا کرے۔ میں بخوفِ طوالت ایسے دو مقامات کا ذکر کرتا ہوں۔

- صفحہ ۲۸۸ پر جہیز کے سامان کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

"اِن کے بعد پلنگ ہوتا ہے..... اور بچھونا ریشمی ڈوریوں سے پایوں میں بندھا ہوتا ہے اور ڈوریوں کے دونوں سروں پر خاص وضع کے نقرئی گچھے لٹکے ہوتے ہیں"۔

یہاں گچھوں سے مراد موٹے ٹھوس پھندنے ہیں جنھیں گُچھے کہنا زیادہ موزوں ہے لیکن اِن کے لیے مخصوص لفظ "جھبا" مستعمل ہے۔ جھبا کی مونث جھبی آتا ہے، چونکہ ہر ڈوری کے ساتھ ایسے دو دو گُچھے آویزاں ہوتے ہیں اِس لیے اِن کے واسطے جمع کا صیغہ "جھبیاں

'لایا جاتا ہے۔پلنگ پر بچھونا بچھا کر جھبیوں سے کسنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُٹھنے' بیٹھنے اور لیٹنے سے بستر پر سلوٹیں نہ پڑیں۔شرر نے شادی کے ضمن میں بنڑے گانے کا ذکر کیا ہے۔اِن گانوں کا تعلق دولھا سے ہوتا ہے۔دُلہن سے متعلقہ گیت سہاگ کہلاتے ہیں۔ایسے ایک گیت میں جھبیوں کا ذکر بھی آتا ہے۔اِس گیت کا ٹیپ کا مصرع ہے:

نین تیرے رسیلے لاڑو' اور بازو بند ڈھیلے

اور وہ جھبیوں والا مصرع یہ ہے:

کچوں تیرے بنڑا سوہے اور جھبیوں کی جوڑی

■ اِسی طرح صفحہ ۲۸۹ پر چوتھی کی رسم کا ذکر ہے۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسم شادی کے چوتھے دن منعقد کی جاتی ہے یعنی برات کے دوسرے دن ولیمہ' تیسرا دن آرام کا اور چوتھے دن عصر یا مغرب کے بعد چوتھی۔شرر نے شادی کے اگلے دن شام کو چوتھی کا ذکر کیا ہے مرتب کو اِس معاملے پر روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔

(د) ''گذشتہ لکھنؤ'' دراصل لکھنؤ کے تمدن کا ایک مختصر دائرۃ المعارف ہے۔اِس سے بہ سہولت مستفید ہونے کے لیے اِس کے آخر میں اشاریہ ہونا نہایت ضروری تھا۔کتاب کے انگریزی مترجمین نے تیرہ صفحات پر مشتمل ایک اشاریہ کا التزام کیا ہے لیکن چغتائی صاحب نے اِس مفید کام پر مطلق توجہ نہیں دی۔

(II)

اِس نمبر کے تحت چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

''۲۔ ''گذشتہ لکھنؤ'' ابتدا ہی سے مختلف ابواب میں منقسم ہے۔اب اِس ترتیب کو تبدیل کر دیا گیا ہے اور اِس کی بجائے موضوعی ترتیب کو اپنایا گیا ہے۔باعتبار موضوع نئے بنیادی اور ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور اُنہی کے مطابق فہرستِ مضامین بھی ترتیب دی گئی ہے۔اِس طرح قارئین کو اصل موضوع کی تلاش میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔''

متن میں ترتیب کی تبدیلی کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ دراصل یہاں چغتائی صاحب اِس بات کے مدّعی ہیں کہ اُنہوں نے قارئین کی سہولت کی خاطر نہ صرف ''گذشتہ لکھنؤ'' کے بلا عنوان ابواب کو عنوان دیے ہیں بلکہ اُنہیں ذیلی عنوانات میں بھی تقسیم کیا ہے۔ چغتائی صاحب کو اصل صورتِ حال کا علم تھا اِس لیے یہ دعویٰ بڑے ذومعنی الفاظ میں کیا ہے یعنی:

''اب اِس ترتیب کو............قائم کیے گئے ہیں۔''

''اب'' کے لفظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کام پہلی بار چغتائی صاحب نے انجام دیا ہے۔ساتھ ہی فعلِ مجہول کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا کہ عنوانات دینے والے شخص یا اشخاص کے نام پردۂ اخفا میں رہے اور قارئین مفت کرم داشتن کے مصداق چغتائی صاحب کے ممنون ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے ''گذشتہ لکھنؤ'' کو محض ابواب میں تقسیم کر کے اُن پر نمبر شار دے دیے تھے اور کتاب کے آغاز میں فہرست کا التزام بھی نہیں کیا تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں یونہی چلتا رہا چنانچہ ورلڈ اُردو سنٹر' کراچی والا ایڈیشن ۵۴ ابواب میں منقسم ہے۔ مکتبہ کلیان والی اشاعت کا بھی یہی عالم تھا البتہ شمیم انہونوی نے نسیم بکڈپو لکھنؤ والا ایڈیشن نکالا تو اُنہوں نے کتاب کے آغاز میں ایک 'فہرست بلحاظ حروفِ تہجّی ''شامل کردی جو دراصل اشاریہ تھا لیکن بجائے کتاب کے اختتام پر چھاپنے کے ابتدا میں درج کردینے کے باعث اِسے ''اشاریاتی فہرست'' کا نام دینا مناسب ہوگا۔ مقدّمہ کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''اِس سے قبل شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں ایک خامی یہ بھی تھی کہ جن مباحث کا اِس میں ذکر ہوا ہے'اُن کی کوئی فہرست شروع یا آخر میں نہیں دی گئی تھی جس کی وجہ سے ناظرین کسی ایک مبحث کے لیے معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں پوری کتاب پڑھنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ اِس ناچیز نے بڑی کدوکاوش سے اِس کے مباحث کی ایک فہرست حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتّب کردی ہے۔گو راقم الحروف کا اِس کام میں کافی وقت لگا اور

خاصی دشواری بھی ہوئی مگر اِس کتاب کے پڑھنے والوں کے لیے اب آسانی ہو جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ میری اِس کاوش کو بھی ناظرین پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔"

درحقیقت "گذشتہ لکھنؤ" کی باقاعدہ فہرست سب سے پہلے رشید حسن خاں نے ترتیب دی تھی۔ اُنہوں نے مکتبۂ جامعہ والی اشاعت میں جو فہرست شامل کی اُس میں کتاب کے مختلف ابواب کے نہ صرف عنوانات قائم کیے بلکہ اُن کے تحت ذیلی عنوانات بھی درج کیے تھے تاہم یہ صرف فہرست کی حد تک تھا۔ متن میں اِن عنوانات کا اندراج نہیں کیا گیا اور محض نمبروں سے کام لیا گیا تھا البتہ تین ابواب یعنی سپہ گری کے فن، درندوں اور چوپایوں کی لڑائی اور طیور کی لڑائی میں ذیلی عنوانات دے دیے تھے۔

"گذشتہ لکھنؤ" کے انگریزی مترجمین نے رشید حسن خاں کے کام پر یہ اضافہ کیا کہ کتاب کے آغاز میں فہرست چھاپنے کے علاوہ متن کے ۵۴ ابواب پر باقاعدہ عنوانات دیے۔ جہاں تک ذیلی عنوانات کا تعلق ہے انگریزی ترجمے میں صرف اُنہی تین متذکرہ بالا ابواب کی حد تک، اُن کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

چغتائی صاحب نے فہرست کی حد تک لفظ بلفظ رشید حسن خان کی پیروی کی ہے سوائے دو مقامات پر خفیف اختلاف کے یعنی رشید حسن خاں کی فہرست میں جہاں ذیلی عنوان "پھنکیتی" ہے وہاں چغتائی صاحب نے "لکڑی" درج کیا ہے۔ دوسرے خان صاحب نے "شیر مال کی ایجاد" کے بعد "باقر خانی" ذیلی عنوان دیا ہے۔ چغتائی صاحب نے یہ ترتیب اُلٹ دی ہے گویا "باقر خانی" پہلے اور "شیر مال کی ایجاد" بعد میں دیا گیا ہے۔

چغتائی صاحب نے اِس بارۂ خاص میں جو کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے خان صاحب کی وضع کردہ فہرست کے جملہ چھوٹے بڑے عنوانات کو کتاب کے متن میں بھی داخل کر دیا ہے اور یقیناً اِس سے قارئین کو سہولت حاصل ہوئی ہے تاہم یہ کہنا کہ:

"اب اِس ترتیب کو تبدیل کر دیا گیا ہے اور اِس کی بجائے موضوعی ترتیب کو اپنایا گیا

ہے" واقعات کی روشنی میں غلط ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ:

"باعتبار موضوع نئے اور ذیلی عنوانات قائم کر دیے گئے ہیں اور اُنہی کے مطابق فہرستِ مضامین بھی ترتیب دی گئی ہے"

حقائق کے خلاف ہے کیونکہ جیسا کہ عرض کیا گیا فہرست میں یہ عنوانات اور ذیلی عنوانات سب سے پہلے رشید حسن خاں نے اور بعد ازاں متن کے ابواب پر عنوانات مترجمینِ انگریزی نے درج کیے تھے۔ چغتائی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے کہ اُنہوں نے متن میں چھوٹے بڑے عنوانات درج کرنے کے بعد فہرست تیار کی۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو وہ رشید حسن خاں سے کہیں تو اختلاف کرتے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ متذکرہ بالا نکتہ نمبر ۱ میں چغتائی صاحب نے تصحیح متن کے ضمن میں خان صاحب کے مرتبہ متن سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے جس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا جب کہ "گذشتہ لکھنؤ" کے مطالب کی فہرست (جو اُنہوں نے سر تا پا رشید حسن خاں کے مرتبہ ایڈیشن سے نقل کی ہے) کے معاملے میں سارا کریڈٹ وہ خود لے رہے ہیں۔

(III)

"۳۔ گذشتہ لکھنؤ میں جو اشخاص، اماکن، کتب، قبائل اور تاریخی واقعات مذکور ہیں، اُن کے بارے میں حواشی کے تحت بالاختصار ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اِن تعلیقات کے ضمن میں گذشتہ لکھنؤ کے انگریزی ترجمہ کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔"

میں نے جب "گذشتہ لکھنؤ" کی اِس تازہ اشاعت کو پڑھنا شروع کیا تو پہلی بات جو کھٹکی وہ تھی حواشی کی کثرت۔ پہلے اڑھائی تین صفحات کے متن پر ۲۵ حاشیے اور اُن میں سے بعض بالکل غیر ضروری اور بیگانہ۔ جو حاشیے برمحل تھے اُن کی زبان کُھردری اور اُکھڑی اُکھڑی تھی۔ طبیعت بڑی منغض ہوئی۔ ذرا آگے بڑھا تو یہ خیال کوندے کی طرح لپکا کہ یہ حواشی براہ راست نہیں لکھے گئے بلکہ غالباً انگریزی زبان سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ قدرتی طور پر میرا خیال

''گذشتہ لکھنؤ'' کے محولہ بالا انگریزی ترجمے کی طرف گیا۔ یہ کتاب میرے پاس نہ تھی۔ایک مہربان سے ذکر کیا تو اُنہوں نے چند دن میں ڈھونڈ نکالی۔جب اِس ترجمے کے انگریزی زبان میں حواشی کا چغتائی صاحب کے درج کردہ حواشی سے مقابلہ کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے محترم نے بقول خود ''اِن تعلیقات کے ضمن میں گذشتہ لکھنؤ کے انگریزی ترجمہ کو ''بھی'' پیشِ نظر'' نہیں رکھا بلکہ درحقیقت:

ع: پیشِ نظر ہے ''ترجمہ'' دائم خیال میں

ایسے معاملات میں فراخ دلی سے کام لینا اچھا ہوتا ہے لیکن اُس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ایسے صریح سرقے کو توارد کیونکر کہا جائے؟دیدہ دلیری کی انتہا یہ ہے کہ انگریزی مترجمین نے اپنی کتاب میں کل ۱۵۵ حاشیے دیے ہیں۔چغتائی صاحب کے ہاں بھی ایک کم نہ زیادہ،حواشی کی تعداد پوری ۱۵۵ ہے۔پھر اُن کی ترتیب میں بھی قسم کھانے کو رد و بدل نہیں کیا گیا۔

اِس اندھا دُھند پیروی نے عجیب مضحکہ خیز کیفیت پیدا کر دی ہے جس کا مبسوط جائزہ لینے کے لیے طویل فرصت کی ضرورت ہے۔مختصر یہ کہ ناقل نے اِن حواشی کا ترجمہ کرنے اور بعض طویل حواشی کو مختصر کرنے میں قدم قدم پر ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ اُن کے پیر شروع سے آخر تک زمین پر جمتے نظر نہیں آتے۔مضمون کی طوالت کے خوف سے یہ مناسب ہوگا کہ ہر قسم کی خرابیوں کا مختلف عنوانات کے تحت ذکر کر کے اُن کی محدود مثالیں پیش کر دی جائیں۔

(الف) عام فہم الفاظ پر حاشیے

پہلی قسم کی خرابی تو وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی ہمارے جانے پہچانے اور پیش پا افتادہ الفاظ و اصطلاحات پر حواشی کا التزام۔ظاہر ہے کہ یہ حاشیے غیر ملکیوں کے لیے ضروری تھے۔خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے جو مسلمانوں اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے تمدن سے ناواقفِ محض ہوں۔ فاضل مرتّب نے یہ تمام حواشی نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اردو میں منتقل کر دیے۔میں ایسے الفاظ کی ایک نامکمل فہرست ذیل میں درج کرتا ہوں۔

قارئین کی سہولت کے لیے اُن حاشیوں کے عنوانات کے ساتھ اُن کا نمبر شمار بھی دیا جا رہا ہے:
(۸)نواب (۱۰)خان (۱۵) بنگلہ (۱۷)مغل (۴۹)منشی (۵۱)فالودہ (۵۲)حکیم (۵۶)حافظ (۵۸)دوآبہ (۶۰) رمضان (۸۵)ایک لاکھ (۹۱)مرزا (۹۳) قاضی (۹۵)ملا (۱۰۶)امام (۱۱۶) کروڑ (۱۱۷)کوتوال (۱۲۹)امام باڑہ (۱۳۶) محلّہ (۱۳۹)کوٹھی (۱۴۰)دربار (۱۵۴)منزل (۱۵۸)مرشد (۱۶۶)شیعہ (۱۶۷)سنّی (۱۷۱) نجف اشرف (۱۷۳)قرآن خوانی (۱۷۴) کربلا (۱۸۲)جامع مسجد (۱۸۵)زکوٰۃ (۱۸۷)تخلّص (۱۹۵)غزل (۱۹۶)قصیدہ (۲۰۴)مثنوی (۲۰۶) خلیفہ (۲۰۷) صوفی (۲۰۸)پردہ دار عورتیں (۲۲۸)جہاں پناہ (۲۲۹)حضور (۲۳۱)حصہ (۲۳۴)نوحہ خوانی (۲۳۵)بہادر (۲۳۷)مشاعرہ (۲۴۲)ٹھگ ڈاکو (۲۴۳)علمِ حدیث (۲۵۰)شاگرد (۲۷۰)عیدالفطر (۳۰۸)رجز (۳۱۷)مرثیہ خوانی (۳۴۸)غزل سرائی (۳۵۲)مفتی (۳۵۷)خاندانی اطبا (۳۶۶) بھانڈ (۳۶۸)بھاشا (۳۸۱)حاجی (۳۸۶)تسبیح (۳۸۸) کشتی (۳۸۹) داروغہ (۳۹۳) صدقہ (۳۹۷) عطر (۴۲۷)چودھری (۴۴۸)تراویح (۴۵۲)ڈھول (۴۶۸)سبیل (۴۶۹)میراثن (۴۸۰) دسترخوان (۴۸۱)پلاؤ (۴۸۴)زردہ (۴۸۹)اچار (۴۹۵)فاتحہ (۴۹۶)نیاز (۴۹۹)صراحی (۵۱۱)مہندی (۵۱۷)دری (۵۲۳) فرش (۵۲۵)مصافحہ (۵۳۵)لوٹا۔

یہ اور ایسے متعدد الفاظ وہ ہیں جن سے پڑھے لکھے اردوخواں ہی نہیں کم سواد اور بے سواد لوگ بھی واقف ہیں چنانچہ اُن پر حواشی کے اندراج کو انگریزی ترجمے پر دیے گئے حاشیوں کی اندھادھند پیروی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

(ب)متن میں موجود تفصیلات کے باوجود غیر ضروری حواشی

مصنف نے ''گذشتہ لکھنؤ'' میں بہت سی چیزوں مثلاً لباس، سواریاں، اور مختلف قسم کے کھانوں کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کی ہیں جو اِس کتاب کا قابلِ قدر حصہ

ہے۔اُس کے باوجود انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں نے اپنے قارئین کی تفہیم کی غرض سے اُن میں سے کئی چیزوں پر صراحتی حاشیے دینا ضروری سمجھا۔اردو میں اصل متن پڑھنے والوں کے لیے یہ حاشیے کسی افادیت کے حامل نہیں۔اُس کے باوجود چغتائی صاحب نے اُنھیں اپنی فہرستِ حواشی میں شامل کرنا ضروری سمجھا۔مثال کے طور پر اشیائے خوردونوش کے ضمن میں شرر نے زیرِ نظر کتاب کے صفحات ۲۱۴ اور ۲۱۷ پر بریانی اور پلاؤ پر باقاعدہ بحث کی ہے۔تاہم چغتائی صاحب فرماتے ہیں:

"(۴۸۱) پلاؤ:ایک قسم کا کھانا جو گوشت اور چاول ملا کر پکاتے ہیں۔لکھنؤ میں پلاؤ کی مخصوص اقسام مقبول تھیں جن میں چاولوں کو الگ سے رنگا جاتا تھا۔"

اور بریانی کے لیے ارشاد ہوا ہے:

"(۴۸۶) بریانی:ایک قسم کا نمکین پلاؤ جس میں گوشت بھون کر ڈالتے ہیں۔"

اِس سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ پلاؤ میٹھا ہوتا ہے اور بریانی اُس کی نمکین قسم ہے۔لیکن چغتائی صاحب بھی کیا کریں۔اِن پر انگریزی میں حاشیے موجود تھے جن کا چھوڑنا اُنھیں گوارا نہ تھا ورنہ اردو میں اِن اوھ بلولے حاشیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

☆حلوہ سوہن کا ذکر کتاب کے صفحہ ۲۲۱ پر موجود ہے۔اِس پر انگریزی حاشیہ بسا غنیمت ہے یعنی:

"493.A hard sweet similar to tofee, prepared with clarified butter and dried fruits."

اب چغتائی صاحب کیسے خاموش رہ سکتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں:

"(۴۹۳) حلوہ سوہن :ایک قسم کی مشہور مٹھائی جو اکثر موسمِ سرما میں تیار کی جاتی ہے۔"

■صفحات ۲۲۲ اور ۲۲۳ پر بالائی اور ملائی کا قضیہ ملتا ہے۔اِس پر انگریزی حاشیہ یوں

ہے:

"435. Thick clotted cream, nearly semi-solid with the skin on the top."

اِس میں کم ازکم انگریزی کریم اور ہماری بالائی کا بنیادی فرق بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔جبکہ چغتائی صاحب کے مطابق:

"(۴۳۵)بالائی: گاڑھی ملائی"۔یہاں گاڑھی کا اضافہ بالکل غیر ضروری ہے کیونکہ بالائی اور ملائی باہم مترادف ہیں ۔ چغتائی صاحب نے لفظ thick کا ترجمہ خواہ مخواہ لازمی سمجھا۔

■اِسی قسم کا ایک حاشیہ موتی پلاؤ پر دیا گیا ہے۔متن کے صفحہ ۲۱۷ پر مصنف نے پلاؤ کی اِس قسم کا تعارف کرایا ہے اور اِس ضمن میں اُس میں پڑنے والے موتی بنانے کی ترکیب بھی بتائی ہے جو سونے چاندی کے ورقوں سے تیار کیے جاتے تھے۔درج ذیل انگریزی حاشیہ در حقیقت سونے اور چاندی کے ورقوں پر تھا:

"497. Edible, gossamer-thin wafers prepared with gold and silver foil and used for decorative purposes."

دراصل انگریزوں کے لئے طلائی اور نقرئی ورق انوکھی چیز تھے اِس لیے اِس حاشیے کا جواز موجود ہے۔دیوانہ را ہوئے بس است کے مصداق چغتائی صاحب اِس پر ارشاد فرماتے ہیں:

"(۴۹۷)ایک قسم کی مٹھائی کا نام جس میں بغرضِ آرائش سونے اور چاندی کے ورق بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔"

بریانی کے ذکر میں چغتائی صاحب نے اُسے "نمکین پلاؤ" کہہ کر پلاؤ کے میٹھا ہونے کا جواشارہ دیا تھا اُس کی اِس حاشیے سے تصدیق ہوگئی جب اُنہوں نے موتی پلاؤ کے مٹھائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ع: جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔چغتائی صاحب کو یہ خیال سنہری روپہلی ورقوں سے آیا ہوگا جو آج کل صرف میٹھے کھانوں اور مٹھائیوں میں استعمال

ہوتے ہیں۔

بادشاہ کی محلّات کی طرف سے جو محبّت بھرے مکاتیب واجد علی شاہ کے نام لکھے جاتے تھے اُن کا ذکر مصنّف نے کتاب کے صفحہ ۱۱۱ پر کیا ہے۔ وہ اُنھیں توزدناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ خود شرر نے لفظ توزدنامہ پر حاشیہ دیا ہے جو زیرِ نظر اشاعت میں صفحہ ۲۲۲ پر بدیں الفاظ موجود ہے:

''توزدنامہ' اُن خطوط کو کہتے ہیں جو بیگمات و محلّاتِ عالیات جہاں پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے۔''

اِس پر انگریزی ترجمے میں دیا گیا حاشیہ اِن الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"239.Written in flowery prose, often accompanied by a poem....."

اُس کے بعد شیدا بیگم کے شاہ کے نام خطوط کا ذکر ہے اور پھر واجد علی شاہ کے نواب اکلیل محل کے نام خطوط کا حوالہ ہے جو ''تاریخِ ممتاز'' کے نام سے ڈاکٹر محمد باقر نے مرتّب کر کے لاہور سے شائع کیے تھے۔

چغتائی صاحب نے توزدناموں کا ذکر اِس سرسری انداز میں کیا ہے:

''(۲۳۹) توزدنامے بمعنی خطوط......'' اِس کے بعد ''تاریخِ ممتاز'' کا نام لیا تاہم اُس کے مرتّب کا نام حذف کر کے اپنی مرتبہ'' تاریخ مشغلہ''(لاہور ۱۹۸۴ء) کا حوالہ دے دیا جو مشغلۃ السلطان نواب آبادی جان بیگم کے نام واجد علی شاہ کے خطوط پر مشتمل ہے۔

میں اِن مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے جن کو مشتے نمونہ از خروارے کہنا چاہیے آگے چلتا ہوں۔

(ج) درست انگریزی حواشی کی ہیئت کذائی

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن پر اچھے بھلے انگریزی حواشی کو نقل کرنے میں چغتائی صاحب نے اپنی بے نیازی سے مسخ کر دیا ہے اور مغلوط بنا دیا ہے۔ ذیل میں ایسی کچھ مثالیں

درج کی جاتی ہیں:

■ "(۲۱۱) او(عربی) دولہ(فارسی) دربارِ مغلیہ کا عہدہ جو اصل اسماء کے ساتھ استعمال ہوتا تھا مثلاً شجاع الدولہ، مظفر الدولہ، روشن الدولہ وغیرہ۔"

"اُد" کوئی لفظ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ "ل" عربی ہے جو آگے پیوست ہوکر "اُد" کی آواز دیتا ہے اور "دولہ" بھی فارسی نہیں عربی ہی ہے۔ "الدولہ" عہدہ نہیں تھا بلکہ خطاب نیز یہ اصل نام کے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور لفظ کے ساتھ بطور لاحقہ آکر خطاب بناتا اور یہ خطاب اصل نام سے قبل لایا جاتا تھا جیسے روشن الدولہ ظفر خان، مختار الدولہ محمود خاں وغیرہ۔ انگریزی حاشیے میں بالکل درست لکھا ہے کہ:

"A title of the Mughal Court, usually added to an adjective or noun..."

■ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ مغربی یو۔پی کے علاقہ کٹہر میں جب روہیلہ افغانوں کی کثیر تعداد آباد ہوگئی تو اُسے روہیلکھنڈ کہا جانے لگا۔ انگریزی ترجمہ میں لفظ روہیلکھنڈ پر ایک طویل حاشیہ (نمبر ۲۳) دیا گیا ہے جس کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے:

"The name given to the region of KATEHR by the Afghans who had come originally from the mountainuous area of Afghanistan (in the Pashtu language Roh or Rohu means a mountain......."

تاہم چغتائی صاحب فرماتے ہیں:

"(۲۳) کٹہر نام افغانوں کا رکھا ہوا ہے جو افغانستان کے پہاڑی علاقوں سے آکر یہاں بس گئے تھے ......۔"

■ حاشیہ نمبر ۹۶ ملا نظام الدین سہالوی پر ہے۔ ضمناً فرنگی محل کی قدیم عمارات کے تذکرے میں انگریزی الفاظ ہیں:

"The original houses in the enclosure survive to this day."

اور ہمارے مرتب لکھتے ہیں: "یہ تاریخی درسگاہ اب بھی موجود ہے۔"

دونوں کا فرق واضح ہے۔ انگریزی حاشیے میں عمارات کا ذکر ہے اور اردو حاشیے میں ادارہ یعنی مدرسہ مراد ہے جو حقائق کے اعتبار سے درست نہیں۔

■ "خلعت" پر حاشیے میں کہا ہے:

"(۱۰۳)خلعت (عربی) وہ کپڑا جو انعام میں بادشاہوں یا امیروں کی طرف سے دیا جائے۔"

انگریزی حاشیے میں خلعت کا ترجمہ "robe of honour" کیا گیا ہے جس کے معنی پوشاک، جبہ اور لبادہ کے ہیں۔ "کپڑے" کی حد تک بھی غنیمت تھا تاہم کپڑا (واحد) دینا اردو محاورے میں کفن دینے کو کہا جاتا ہے۔

■ لال بارہ دری پر انگریزی حاشیے میں صاف لکھا تھا:

"150.Hindi LAL,red.The building was so called because of the coloured stone or the thick red plaster of which it was built."

اور اردو حاشیے میں کہا گیا ہے:

"(۱۵۰) لال (ہندی) بمعنی سرخ۔ یہ عمارت سنگِ مرمر سے بنائی گئی تھی اس لیے یہ لال بارہ دری کے نام سے موسوم ہے۔"

یہاں انگریزی حاشیہ نگار کی مراد سنگِ سرخ سے تھی۔

■ حاشیہ نمبر (۱۸۸) "سول لائنز" پر ہے۔ اس میں چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

"ابتدائی برطانوی دور میں ہندوستانی شہروں میں انگریزی سول افسران کے دفاتر اور رہائش گاہیں سول لائنز کہلاتی تھیں۔"

اس مختصر سے حاشیے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بعد میں سول لائنز کا وجود مٹ گیا یا اُن کو کوئی اور نام دے دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ انگریزی حاشیے کا درمیانی جملہ، جو مرتب نے حذف کر دیا ہے، بات کو واضح کر دیتا۔ وہ جملہ یہ ہے:

"In time the Civil Lines became the residential quarters of the Indian elite as well."

- یہ حاشیہ لفظ ''خلیفہ'' پر ہے۔ لکھتے ہیں:

''(۲۰۶) خلیفہ (عربی) بمعنی جانشینی۔ چار خلفائے راشدین (۶۳۲ تا ۶۶۱ء) کے اسماء کے ساتھ یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ اِن چار بزرگ خلفاء کے ناموں کے ساتھ ''راشدین'' کے اضافہ سے اُن کے خصوصی مقام کا اظہار ہوتا ہے ورنہ ''خلیفہ'' کے لقب کا اطلاق بنو اُمیہ' بنو عباس' بنو فاطمہ اور پھر ایک وقفے کے بعد عثمانی حکمرانوں کے ناموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ بیسویں صدی میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ انگریزی حاشیہ بہتر اور واضح ہے جو میں بخوف طوالت نقل کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ ''جانشینی'' بجائے ''جانشین'' طباعت کی غلطی ہے۔

- چغتائی صاحب '' سجادہ نشین'' کی ترکیب پر یوں حاشیہ دیتے ہیں:

''(۲۶۴) سجدہ (عربی) نماز کا اہم رکن۔ جب نمازی زمین پر ماتھا رکھ کر اپنے پروردگار کی عزمت [؟عظمت] کا احترام [؟اقرار] کرتا ہے۔ سجادہ نشین' کسی بزرگ کی گدی پر بیٹھنے والا۔ کسی بزرگ کا خلیفہ۔''

اِن دو فقروں کے درمیان انگریزی حاشیے سے چند الفاظ چھوٹ گئے ہیں یعنی:

"SAJJADA:Prayer mat,and persian NASHIN:sitting."

جس سے حاشیے کا تسلسل بگڑ گیا ہے۔

- حاشیہ (۲۶۹) سعادت یار خان رنگین پر ہے۔ اِس کا آخری جملہ ہے: ''قتیل' انشا اور رنگین تینوں دوست تھے اور انھوں نے اردو شاعری کے لکھنوی دبستان کو خاص رنگ تفویض کیا۔''

یہ پڑھ کر مجھے تعجب ہوا۔ دوستی اپنی جگہ لیکن قتیل کا لکھنؤ کے اردو دبستانِ شاعری کی تشکیل میں کیا کام؟ جب انگریزی حاشیہ دیکھا تو وہ یوں تھا:

"269.- - - - - Qatil, Insha and Rangin were personal friends:the last two gave Urdu poetry of the Lucknow School a carefree, youthfull and merry tone."

گویا بات ہوری تھی لتا اور نگین کی لیکن چغتائی صاحب نے قتیل کو بہ جرمِ دوستی لپیٹ لیا۔

☆مولانا محمد حسین آزاد کے نام کے ساتھ اُن کے خطاب "شمس العلماً" پر حاشیے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"(۲۷۳) شمس العلماً کا خطاب انگریزی حکومت کی جانب سے نامور مذہبی شخصیات کو دیا جاتا تھا۔"

کیا صرف مذہبی شخصیات کو؟ لیکن کیوں؟ انگریزی حاشیے کے الفاظ حقیقت سے زیادہ قریب ہیں جو یہ ہیں: "- - - - - scholars and religious leaders."

■ حاشیہ (۳۸۵) فن بانک کی ایک اصطلاح "پیچ بندھنے" پر ہے ۔اِسے انگریزی مترجمین نے "pinion" سے موسوم کیا ہے اور یوں حاشیہ دیا ہے:

"To pinion in BANK is to render the opponent helpless by twisting his limbs in such a way that his body becomes a knot."

to pinion کشتی کی اصطلاح میں مشکیں کسنے کو کہا جاتا ہے اور یہی چیز بانک کے فن میں پیچ بندھنا کہلاتی ہے۔لیکن اِس پر چغتائی صاحب کا حاشیہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

"فنونِ سپہ گری کی ایک قسم کی ورزش جس کو خم دار چھریوں سے بیٹھ کر یا لیٹ کر کھیلتے ہیں۔" دونوں حاشیوں میں آسمان اور ریسمان کا سا فرق ہے۔

■ جنیو یعنی زنار پر چھ سطری انگریزی حاشیہ نہایت معلوماتی ہے جب کہ اردو میں یہ مختصر سا حاشیہ ملتا ہے:

"(۳۸۷) جنیو: زنار۔وہ بٹا ہوا دھاگہ جس کو برہمن گلے میں بدّھی کی طرح ڈالے رہتے ہیں۔"

بدّھی (بادال مفتوح) بمعنی ہار کو باقاعدہ پیش لگا کر بُدّھی لکھا گیا ہے۔بُدّھی بدھ کا مترادف ہے جو عقل و دانش اور سمجھ بُوجھ کو کہتے ہیں ۔سُدھ بُدھ میں یہی لفظ شامل ہے۔بہر حال یہ حاشیہ بُدّھی کے پھیر کا شاخسانہ ہے اور بس۔

■ معروف ساز ''سرود'' کا تعارف انگریزی کے تین سطری حاشیے میں ملتا ہے جس میں اُس کے سولہ تار بتائے گئے ہیں تاہم چغتائی صاحب ایک نیا انکشاف کرتے ہیں یعنی:

''(۴۱۸)سرود:ایک ساز جس کی سو تاریں ہوتی ہیں ۔بجانے کے لیے مضراب استعمال کی جاتی ہے۔''

خدا جانے اُنہوں نے سو تاروں کی بات کیوں کی۔ممکن ہے ''سرود'' کو ''سو رود'' کا مخفف سمجھا ہو اور سو کے عدد سے یہ معنی اخذ کیے ہوں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک مولوی صاحب نے نمازِ تراویح کی رکعتوں کی تعداد بیس ہونے کے حق میں یہ دلیل دی تھی کہ خود ''تراویہ'' میں ''ویہہ'' یعنی بیس کی تعداد بتا دی گئی ہے۔

■ انگریزی معاشرے کے لیے ''پوری'' ایک انوکھا پکوان ہے۔اِس بنا پر انگریزی مترجمین نے اِس پر حاشیۂ ذیل دیا تھا:

"434. Thick pan cakes about six inches in diameter,fried in clarified butter or oil;hence an expensive item."

اِس حاشیے میں بعض کوتاہیاں ہیں پھر بھی غنیمت ہے۔چغتائی صاحب فرماتے ہیں:

''(۴۳۴)پوری،میدے سے بنائی جاتی ہے اور تیل میں تیار کرنے کے بعد حلوے سے کھائی جاتی ہے۔''

انگریزی حاشیے میں پوریاں گھی میں تلنے کی بھی اجازت دی گئی تھی تاہم ہمارے مرتّب نے تیل کی قدغن لگا دی ہے۔یہ امر بھی حکمت سے خالی نہیں ۔امراضِ دل میں اضافے کے باعث اب گھی کا استعمال خطرناک سمجھا جاتا ہے لیکن تیل میں ''تیار کرنے'' کے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔سیدھا سا ''تلی جاتی ہیں'' لکھ دیتے ۔پھر یہ پابندی تو بالکل ناروا ہے کہ اِس کو صرف حلوے سے کھایا جائے۔خود مصنف نے اِسی کتاب میں (صفحہ ۱۸۲)لکھا ہے کہ بڑے حیدری خان پوریاں بالائی سے کھاتے تھے۔

■ ''(۴۵۰)تنبورہ:ایک قسم کا ساز جس میں ستار کی طرح ایک تار لگا ہوا ہوتا ہے۔چونکہ

تونبے میں لکڑی لگا کر اُس میں یہ تار لگا دیتے ہیں اِس لیے یہ نام رکھا گیا ہے۔ اِس کی چار یا چھ تاریں ہوتی ہیں۔''

ستار یا تنبورہ ایک تار پر مشتمل نہیں ہوتے ۔ ایک تار والا ساز اِکتارہ کہلاتا ہے۔ پھر اگر یہ ایک تار کا ہوتا ہے تو چار یا چھ تاروں کا کیا مطلب ہے۔ انگریزی حاشیہ بالکل واضح ہے:

"450.A simple stringed instrument with a narrow neck and a gourd at the end.It has four to six strings- - - - "

ڈھول پر انگریزی زبان میں حاشیہ یوں ہے:

" 452. Also a cylindrical drum with a skin stretched over each end,played on both sides."

اور اردو حاشیہ:

''(۴۵۲) ڈھول: پنجاب کا ایک مقبول ساز جو کشتیوں اور شادیوں کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔''

اوّل تو ڈھول پر حاشیے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر دینا ہی تھا تو اتنا کافی ہوتا: ''تال کا معروف ساز۔'' ڈھول پنجاب میں مقبول ضرور ہے تاہم پنجاب تک محدود نہیں اِس لیے یہ حاشیہ قارئین کی غلط فہمی کا باعث ہوگا۔

■ ''(۴۸۸) چٹنی: وہ کُٹھی (؟ کھٹی) چیز جس میں ہرا دھنیا، پودینہ، نمک مرچ وغیرہ ڈال کر پیس لیتے ہیں۔''

متن میں اِس مقام پر لفظ چٹنی سے یہ سادہ اور وقتی چٹنی مراد نہیں ہے جو غریبوں کے لیے سالن کا کام دیتی ہے بلکہ وہ چٹنی جو پھلوں کے گودے میں سرکہ، نمک، مرچ، چینی، مسالے اور کشمش وغیرہ ڈال کر تیار کی جاتی ہے اور مہینوں کام دیتی ہے۔ یہ انگریزی جیم (jam) سے ملتی جلتی چیز ہے۔ اِس پر انگریزی حاشیہ یوں ہے:

88.A preparation of fruits and vegetables cooked in spices to a thick paste and preserved in vinegar.

اِس کے بعد مترجمین نے اضافی طور پر دوسری قسم کی چٹنی کا ذکر بھی بدیں الفاظ کر دیا

ہے:

"In Lucknow some special Chutneys are also prepared from fresh vegetables without cooking or vinegar."

یہاں ''سپیشل'' کا لفظ محض تکلف ہے۔ یہ غریبانہ چٹنی کسی خصوصیت سے عاری ہوتی ہے اور برِعظیم کے طول و عرض میں رائج ہے، لکھنؤ سے مخصوص نہیں۔ بہر حال ہمارے مرتّب نے متن میں جو اصلی چٹنی مراد تھی اُسے چھوڑ کر اِس اضافی نوٹ پر انحصار کر لیا۔

■ ''(۴۹۴) نہاری بڑے گوشت اور دالوں سے تیار کیا جانے والا صبح کا ناشتہ جس میں تیز مرچ مسالہ استعمال کیا جاتا ہے۔''

نہاری میں دالیں مطلق نہیں ڈالی جاتیں۔ ہاں حلیم اور ہریسے میں ڈلتی ہیں۔ انگریزی حاشیہ بالکل درست ہے:

"494. A breakfast curry prepared in Lucknow according to a special recipe,with spices and cuts of meat."

■ ''(۵۰۰) آبخورہ پانی پینے کا مٹی، تانبے یا پیتل کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن۔''

آبخورا صرف مٹی سے بنا ہوا مخصوص وضع کا برتن ہوتا ہے۔ کسی دھات کے برتن کو آبخورہ ہرگز نہیں کہا جاتا۔ انگریزی حاشیہ بڑا واضح اور درست ہے:

"An earthenware goblet for drinking water,baked but left totally unglazed.In both SURAHIS and ABKHORAS,the unglazed clay imparts a refreshing fragrance to the drinking water."

■ نمبر ۵۰۲ کے تحت انگریزی حاشیے کا آغاز اِس جملے سے ہوتا ہے:

The dress most popular today for everyday life in the cities is KURTA and trousers- - - -"

چغتائی صاحب نے اِس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''ان دنوں شہروں میں شلوار قمیص کا زیادہ رواج ہے ......۔''

trousers زیر جامے کو کہتے ہیں جس سے یہاں پائجامہ مراد ہے شلوار نہیں۔ کُرتے اور قمیص کا فرق بھی معلوم ہے۔ کُرتا مشرقی لباس ہے اور قمیص کو عربی لفظ ہے تاہم

آجکل ہم جس لباس کو قمیص کہتے ہیں وہ مغربی چیز ہے۔مرتّب نے سیاق و سباق کا لحاظ کیے بغیر کُرتے پاجامے کو از خود شلوار قمیص سے بدل دیا حالانکہ ذکر لکھنؤ کے پہناوے کا ہو رہا ہے ،لاہور یا پشاور کے لباس کا نہیں ۔

- ''(۵۴۱) گلوری: بنا ہوا پان جو ایک خاص وضع پر لپیٹا جاتا ہے اور اس کے تین کونے ہوتے ہیں ۔''

مرتّب کو گلوری اور بیڑے میں التباس ہوا ہے۔گلوری مخروطی شکل میں لپیٹا ہوا پان ہوتا ہے جیسا کہ تنبولی اپنے گاہکوں کو دیا کرتے ہیں ۔اس کے تین کونے ہرگز نہیں ہوتے۔تین کونوں والا پان بیڑا کہلاتا ہے جس کو لگانے کے بعد دائیں بائیں اور بالائی جانب سے موڑ کر مثلث کی شکل دے دی جاتی ہے اور اس صورت کو قائم رکھنے کے لیے اس میں ایک لونگ لگا دی جاتی ہے۔یہاں بھی انگریزی حاشیہ بڑا مناسب ہے:

"541.A prepared betal leaf folded in a conical fashion and decorated with edible silver paper."

ظاہر ہے کہ چاندی کے ورق تقریبات وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں تاہم یہ بیڑے کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت نہیں رکھتے ۔

- یہ حاشیہ بیسن (دانی) پر ہے:

''(۴۵۹) ایک پھلی دار پودے (Chick-Pea) کا سفوف جو صابن کے رواج پانے سے قبل نہانے اور کپڑے دھونے میں استعمال کیا جاتا تھا۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فاضل مرتّب ''بیسن'' نامی شے سے واقف نہیں ؟ حالانکہ انگریزی حاشیے کا آغاز ہی اس لفظ سے ہوتا ہے:

"Hindi BESAN :flour of chick-pea,used for washing and bathing before the introduction of soap."

بیسن نہانے اور زیادہ تر ہاتھ دھونے میں استعمال ہوتا تھا۔چغتائی صاحب اس سے کپڑے دھونے کا انکشاف کر رہے ہیں ۔بیسن ہاتھوں سے چکنائی اور جسم سے پسینے کی

چیچپاہٹ تو یقیناً دور کر سکتا ہے تاہم کپڑوں سے میل نکالنا اِس کے بس کا روگ نہیں ۔اِس مقصد کے لیے تجی' کھار اور شورہ کام میں لایا جاتا تھا۔

(د) مغلوط انگریزی حواشی کی اردو میں منتقلی

ایک خاصی تعداد اُن مغلوط حواشی کی ہے جن کے ذمہ دار "گذشتہ لکھنؤ" کے انگریزی مترجمین تھے۔ چغتائی صاحب نے بھی اِن حاشیوں میں در آنے والی اغلاط پر مطلق غور نہیں کیا اور اُن کا ہو بہو اردو ترجمہ کر ڈالا اور یوں اُن تمام غلطیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ۔میں یہاں کچھ چیدہ چیدہ مثالیں درج کرنے پر اکتفا کروں گا:

- نواب شجاع لدولہ کے عہد حکومت میں فیض آباد کی تعمیرات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا: "اِسی زمانے میں ترپولیہ اور چوک بازار تعمیر ہوئے" (صفحہ ۵۱)

چغتائی صاحب "ترپولیہ" پر حاشیہ دیتے ہیں:

"(۲۶) تری (ہندی) بمعنی تین اور پلیا (بمعنی پُل) دریائے گھاگھرا کے نزدیک اجودھیا میں واقع چھوٹا سا علاقہ جس میں تین پل ہیں۔"

یہ عبارت درج ذیل انگریزی حاشیے کا لفظی ترجمہ ہے:

"26. Hindi TRI,Three and PULYA,a foot bridge.The name of a small area in Ajodhya,near the River Ghagra where there were three foot-bridges."

کیسا گھاگھرا اور کہاں کا اجودھیا؟ چغتائی صاحب ترپولیہ کا مطلب نہیں سمجھے اور پولیہ کو صوتی مماثلت کی بنا پر پُلیہ (پُل کی تصغیر) سمجھ بیٹھے۔ پولیہ =پول (واو مجہول)+یہ (نسبت)=پھاٹک والا۔پول کا پُل سے کوئی تعلق نہیں ،اِس کے معنی ڈیوڑھی' پھاٹک یا گھر کے داخلی دروازے کے ہیں ۔مارواڑی زبان کا ایک گیت ہے:

سوالکیاں کی ڈیکری بڑی پول میں پیشے
اوڑھے کالی لوکڑی ڈاکن ہو جیوں دیشے

(ناکوریوں کی بڑھیا ڈیوڑھی میں چکی پیسنے میں مشغول ہے۔کالی چادر اوڑھے ہوئے وہ بالکل ڈائن دکھائی دیتی ہے)۔

علاوہ ازیں پول یا پولیہ ایسے بازار یا سڑک کو کہتے ہیں جس کے آغاز میں پھاٹک بنا ہوا ہو اور ترپولیہ کے لفظی معنی ''سہ درہ'' کے ہوتے ہیں ۔اصطلاح میں یہ ایسے بازار کو کہا جاتا ہے جس میں داخلہ تین جڑواں دروازوں سے ہوتا ہے۔درمیانی دروازہ بڑا ہوتا ہے جس سے شاہی سواری کا ہاتھی گزر سکے۔دائیں بائیں دو چھوٹے دروازے بنائے جاتے ہیں جن سے پیدل چلنے والے گزرتے ہیں ۔دہلی 'لکھنؤ' جے پور وغیرہ شہروں میں بھی ترپولیے تھے ۔شجاع الدولہ نے فیض آباد میں ترپولیہ بنوایا تھا۔

■ شرر نے نواب شجاع الدولہ کے رسالے کے افسر اعلیٰ کا نام نواب مرتضیٰ خان بریچ لکھا ہے(صفحہ ۵۷)۔لفظ ''بریچ'' پر چغتائی صاحب یہ حاشیہ دیتے ہیں :

''(۳۳)بریچ لوڈر۔پیچھے سے بھرنے والی بندوق۔''

کیا نواب مرتضیٰ خان بریچ 'کسی پیچھے سے بھری جانے والی بندوق کا نام تھا؟اِس سے زیادہ مضحکہ خیز حاشیے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔لیکن چغتائی صاحب بھی کیا کریں ۔اُن کے ممدوحین یعنی انگریزی مترجمین نے ''بریچ'' پر حاشیہ ذیل دیا ہے:

"Breech Loader,was the name of the muskets used at that time, which were loaded from the back. Perhaps because of his position in the army,the popular name for these muskets --BREECH--- was added to Nawab Murtaza Khan's name."

بات صرف اتنی تھی کہ نواب مرتضیٰ خان کا تعلق روہیلہ پٹھانوں کے اہم قبیلے بڑیچ (بھڑیچ یا بھڑ اچ) سے تھا اور بس ۔یاد رہے کہ مشہور روہیلہ سردار حافظ رحمت خان شہید بھی

اِسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

■ ''گذشتہ لکھنؤ'' کے صفحہ ۵۷ پر یہ عبارت ملتی ہے:

''اُن کے اَمیرِ اعلیٰ یعنی سپہ سالارِ اعظم سیّد احمد تھے جو بانسی والا کے لقب سے مشہور تھے۔''

'بانسی والا'' پر درج ذیل انگریزی حاشیہ دیا گیا ہے:

"40.Persian VALA, eminent, dignitary and Bansi,a town in the district of Bansi,U.P.;also a bamboo fence.Thus Saiyyid Ahmed either originated from the town of bansi or was so called becaus e of bamboo fencing that was probably extensively used around his house."

چغتائی صاحب کی سادگی پر تعجب ہوتا ہے جب وہ اِس احمقانہ انگریزی حاشیے کو بڑے خشوع وخضوع سے اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

''(۴۰)والا (فارسی) بمعنی معروف معزز۔ضلع بنسی (اُتر پردیش) کا ایک شہر۔بانس کی باڑھ۔سیّد احمد کا تعلق بنسی شہر سے ہوسکتا ہے اور اُس کے گھر کے اِردگرد ایسی باڑھ ہوگی جس کی وجہ سے بنسی والا کہا جانے لگا۔''

یہ حاشیے ژولیدہ خیالی کی اچھی مثال ہیں اور اِن میں پایا جانے والا تذبذب فنِ تحقیق کی روح کے خلاف ہے کہ مختلف تاویلات میں سے کوئی نہ کوئی تو ٹھیک نکلے گا۔لطف یہ ہے کہ چغتائی صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے حاشیے کو اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ ''والا'' فارسی (والا جاہ'والا شان)والا نہیں ہے'اردو'' والا'' ہے جو نسبت کا اظہار کرتا ہے اور جس کی مونث ''والی'' آتی ہے جیسے بمبئی والا'رنگون والا'افریقہ والا'کلکتے والی 'انبالے والی وغیرہ۔لطف یہ ہے کہ حاشیے کے پچھلے حصے میں استاد شاگرد دونوں فارسی ''والا'' سے دستبردار ہو کر اردو''والا'' پر آجاتے ہیں۔

انگریزی فقرہ:''Bansi,a town in the district of Bansi-'' میں دوسرا

بانسی طباعت کی غلطی ہے۔ یہاں بستی (Basti) ہونا چاہیے تھا جو شمال مشرقی یو۔پی کا ایک ضلع ہے۔ ہمارے مرتّب نے بجائے اس کی درستی کے ضلع کا نام ''بنسی'' کردیا اور پہلا 'بانسی'' اُڑا کر فقرہ ہی مہمل کر ڈالا۔ اب اُن کے پہلے جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ''والا'' ضلع بنسی کے ایک شہر کا نام ہے یا پھر بانس کی باڑ کو والا کہا جاتا ہے۔ ''باڑھ'' کی جگہ ''باڑ'' لکھنا چاہیے تھا۔ بانس سے نسبت ''بانسی'' بنتی ہے بنسی نہیں۔ بنسی 'مچھلیاں پکڑنے کی چھڑی کو کہتے ہیں اور یہ بانسری (بنسری) کا مخفف بھی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ سیّد احمد موصوف کا تعلق ضلع بستی کے معروف قصبے بانسی سے تھا جو دریائے راپتی کے کنارے واقع ہے اور باقی یاروں کی حاشیہ آرائی ہے۔

■ ''ماہی مراتب'' پر چغتائی صاحب نے یہ حاشیہ دیا ہے:

''(۷۸) ماہی (فارسی) مچھلی اور عربی مراتب (عزّت) ایک خطاب جو مغل بادشاہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔''

انگریزی حاشیے میں بھی 'جو زیادہ واضح ہے 'ماہی مراتب کو:

"A title conferred by the Mughal Kings as a mark of distinction on individuals of the highest order- - - "

بتایا گیا ہے۔ دراصل ''ماہی مراتب'' خطاب نہیں بلکہ ایک امتیازی نشان یا مرتبے کی علامت ہے اسی لیے اِس کے ساتھ لفظ '' عَلم'' کا اضافہ کیا جاتا ہے چنانچہ شرر نے بھی اِس کا التزام کیا ہے اور لکھا ہے:

''شیخ عبدالرحیم کو دربار شاہی سے عَلم ماہی مراتب عطا ہوا تھا......'' (صفحہ ۶۳)

جس طرح خطبہ اور سکہ بادشاہت کی مخصوص علامات ہیں اسی طرح اُس کے نائبین کو ''چتر و دُورباش'' سے ممتاز کیا جاتا تھا۔ مغلیہ دور میں ''ماہی مراتب'' کا رواج ہوا۔ اِس کی صورت عموماً یہ ہوتی تھی کہ ایک لمبے بانس پر ایک آڑی لکڑی لگا کر اس کے درمیان چاندی کی ایک مچھلی آویزاں کردی جاتی تھی اور اس کے دونوں جانب دو نقرئی ہلال معلّق ہوتے تھے گویا

ماہ و ماہی کا مجموعہ ہوتا تھا' جو غالباً اختیارات کی وسعت کی طرف اشارہ ہے۔بہر حال ماہی مراتب کو نام کا حصہ نہیں بنایا جاتا تھا اِس لیے اِس کو خطاب کہنا مناسب نہیں ۔البتہ انگریزی میں لفظ ''ٹائیٹل'' کی وسعت کے پیشِ نظر شاید اِس کی گنجائش نکل سکے۔

■ ''پیر خان کی گڑھی'' پر انگریزی حاشیے کا آغاز یوں آتا ہے:

"101.Hindi GARH :a small fort- - - -"

اور چغتائی صاحب بھی اِسی رو میں لکھ رہے ہیں:

''(۱۰۱) گڑھ (ہندی) ایک چھوٹا قلعہ......۔''

بڑی عام فہم بات ہے ۔گڑھ بڑا قلعہ ہوتا ہے۔چھوٹے قلعے کو گڑھی کہتے ہیں جس کا اسمِ تصغیر گڑھیا آتا ہے۔بہر حال دونوں حاشیوں میں ''گڑھ'' کے بجائے ''گڑھی'' ہونا چاہیے تھا۔

■ ''(۱۲۱) احمد شاہ کا تعلق ایک افغان قبیلہ ابدالی سے تھا۔تختِ نشینی کے بعد وہ درِّ دوراں کا خطاب استعمال کرنے لگے۔ ...... ۔''

احمد شاہ ابدالی نے اپنے لیے ''درِّ دوراں'' نہیں ''دُرِدُرّاں'' کا لقب پسند کیا تھا۔دراصل یہاں بھی انگریزی حاشیے کی پیروی کی گئی ہے جو یوں ہے:

"121.Ahmad Shah belonged to an Afghan tribe called Abdali.On succession to the throne he assumed the title of durr-i-dauran......-"

انگریزی حاشیے کے اختتام پر '' مجمدار' ص۵۳۴'' کا حوالہ دیا گیا ہے۔چغتائی صاحب دونوں کا حوالہ گول کر گئے اور غلطی اپنے سر لے لی۔

■ فاضل مرتب نے بغیر سوچے سمجھے جس مستقل مزاجی کے ساتھ انگریزی حواشی کی پیروی کی ہے وہ وفاداری بشرطِ استواری کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔اس کی ایک نمایاں مثال ''پردہ'' کا قضیہ ہے جس پر میں مختصر روشنی ڈالتا ہوں ۔لکھنؤ میں شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے یہ جملہ لکھا تھا:

''مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہو کے اُن

کے خراب کرنے کا آلہ بنایا...... ۔''(صفحہ۹۶)

اِس کا انگریزی ترجمہ یوں کیا گیا:

"Nawab Mirza Shauq in his poems became the lover of beautiful veiled women208 and made his poetry the scourge of onventional morality. "(page.63)

اور اِس پر یہ حاشیہ دیا گیا:

"208 .Muslim women are required by religion and custom to live in PURDAH (behind curtains),that is,inside the house.Only immodest and loose women did not follow this custom. Hence the expression 'veiled women' meant modest and chaste women whom no male outside the family had seen,'not even the sun' as the expression goes.This custom is dying out."

اب آگے کی سنیے۔ مصنّف نے مردانہ لباس کے ذیل میں ''جامہ'' کے تعارف میں لکھا تھا کہ ''اِس میں گریبان نہ ہوتا بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو 'پردہ' کہلاتے 'ترچھے ایک دوسرے پر آ کے سینے کو ڈھانپ لیتے......''۔(صفحہ۲۲۷)

"It had a collar but the lapels on both sides,which were known as PARDA 208, curtains folded over each other and covered the chest."(page.169).

عبارت کے آغاز میں غالباً ''no collar'' کی بجائے ''a collar'' چھپ گیا ہے۔ تاہم اِس سے یہاں بحث نہیں۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ گو اِس ''پردہ'' جو درزیوں کی ایک اصطلاح ہے اور خواتین کے ''پردہ'' میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے تاہم یہ لفظ آتے ہی انگریزی مترجمین کو جبلّی طور پر وہ ''پردہ'' یاد آ گیا اور اُنھوں نے اُسی سابقہ حاشیے کا نمبر ۲۰۸ اِس ''پردہ'' پر بھی چسپاں کر دیا جس سے عجیب مضحک کیفیت پیدا ہو گئی۔ چغتائی صاحب نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دونوں جگہ ایک پنتھ اور دو کاج پر عمل کرتے ہوئے حاشیہ کا نمبر ۲۰۸ درج کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قاری دوسرے ''پردہ'' یعنی جامہ کے پلّوؤں کے بارے مزید جاننے کی غرض سے حاشیہ نمبر ۲۰۸ دیکھتا ہے تو وہاں فاضل مرتّب کی یہ عبارت اُس کی منتظر ہوتی ہے:

(۲۰۸)' اسلام میں عورتوں کے لیے پردہ لازم ہے ۔پردہ نشین خواتین سے ایسی ہی عورتیں مراد ہیں ۔موجودہ دور میں پردے کا رواج روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔"

■ ''کوڑی'' پر درج ذیل انگریزی حاشیہ ملتا ہے:

> "236.Hindi KAURI:a small shell,also the smallest denomination of Indian currency,which became obsolete in the 1920s.At that time four cowries were equivalent to one paisa,four paisasone anna and sixteen annas a rupee. In the late 1960s India adopted the decimal system in currency and one rupee is now equal to a hundred new paisas."

اردو حاشیہ حسب معمول انگریزی حاشیے کا ترجمہ ہے:

"(۲۳۶) کوڑی (ہندی) ایک قسم کا چھوٹا سکہ جو خرید و فروخت میں ادنیٰ سکہ کا کام کرتا ہے۔۱۹۲۰ء میں اسے ختم کر دیا گیا ۔ اِس سے پہلے چار کوڑیوں کا ایک پیسہ' چار پیسوں کا ایک آنہ اور اور سولہ آنوں کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا۔"

چغتائی صاحب اگر دیانتداری سے انگریزی حواشی کا ترجمہ کر دیتے تو بہت سی غلطیوں اور خامیوں سے بچ سکتے تھے۔اب یہاں اُن کا پہلا فقرہ ہی بے معنی ہے ۔چھوٹے سکے اور ادنیٰ سکے میں کیا فرق ہے؟ کوڑی کوئی باقاعدہ ٹکسالی سکہ نہ تھی بلکہ علامتی حیثیت رکھتی تھی۔دونوں حاشیوں کی مشترک غلطی یہ ہے کہ ایک پیسے میں چار کوڑیاں بتائی گئی ہیں حالانکہ ایک پیسے میں چار چھدام اور ایک چھدام میں دو اَدھیاں یا چار کوڑیاں ہوتی تھیں گویا پیسے میں سولہ کوڑیاں۔ اصطلاح میں چار چیزوں کے مجموعے (چوکڑی) کو گنڈا کہا جاتا ہے۔اِس لیے چار کوڑیوں (یعنی ایک چھدام) کو عرفِ عام میں گنڈا کہتے تھے ۔گویا پیسے کی تقسیم یوں بنتی ہے۔ایک پیسہ = دو اَدھیلے (دھیلے) = چار چھدام (یا گنڈے) = آٹھ اَدھیاں = سولہ کوڑیاں ۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ لین دین میں کوڑی کا خاتمہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہو گیا تھا ۔مہنگائی بڑھنے کے سبب انگریزی علاقوں میں کوڑیوں کا رواج متروک ہو گیا تھا تاہم دیسی ریاستوں میں ۱۹۴۷ء تک اِن کا چلن باقی تھا ۔چغتائی صاحب نے انگریزی حاشیے کا

آخری جملہ چھوڑ دیا ہے جس سے اُن کا بیان یہ مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد روپے کی کوڑیوں، پیسوں اور آنوں میں تقسیم ختم ہوگئی حالانکہ آنوں اور پیسوں کا رواج ہندوستان اور پاکستان میں ۱۹۶۰ء کے بھی بعد تک رہا ہے۔

■ شرر نے فارسی میں مثنوی کے ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے فردوسی کے بعد نظامی کا نام لیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۷) انگریزی مترجمین نے اس پر حاشیۂ ذیل دیا ہے:

"293.Nizami Arudi:born in Samarqand,lived in the early century. A courtier and poet."

یہ حاشیہ لاعلمی اور حماقت کا آئینہ دار ہے۔ بے چارے نظامی عروضی سمرقندی کا نام تک مثنوی گویوں میں نہیں آتا۔ اُس کے تخلص کے چند اشعار ملتے ہیں وہ بھی اُس کی تالیف چہار مقالہ (''مجمع النوادر'') میں شامل ہیں۔ شرر کی مراد معروف مثنوی گو مولانا نظامی گنجوی (۵۳۵۔۵۹۹ء) سے ہے جن کا خمسہ مثنوی گوئی کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ چغتائی صاحب نے بھی بغیر اس حقیقت پر توجہ دیے، لکھ دیا:

''(۲۹۳) نظامی عروضی سمرقندی۔ ابتدائی بارھویں صدی میں بقیدِ حیات تھے۔''

■ شرر نے فارسی مثنوی گویوں میں خسرو کا نام بھی لیا ہے جس سے اُن کی مراد یقیناً حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں۔ لیکن انگریزی حاشیہ نویس نے یہ عزت ناصر خسرو کو بخش دی۔ لکھتے ہیں:

"295.Nasir-e-Khusraw:1004-1077.Traveller,sceptic and poet."

ناصر خسرو نے دو مثنویاں ''زاد المسافرین'' اور ''روشنائی نامہ'' اپنی یادگار ضرور چھوڑی ہیں جن میں سے پہلی میں اُس کے سفر کے حالات اور دوسری میں اسماعیلی مذہب کا پرچار ملتا ہے۔ تاہم فارسی مثنوی نویسی کے میدان میں اُس کا مقابلہ امیر خسرو سے کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ امیر خسرو نے خمسۂ نظامی کا کامیاب ترین جواب اپنی پانچ مثنویوں میں پیش کیا ہے جن کے نام مطلع الانوار، شیریں و خسرو، آئینہ سکندری، ہشت بہشت اور مجنوں و لیلیٰ ہیں

۔علاوہ ازیں تاریخی اور نیم تاریخی موضوعات پر بھی انہوں نے پانچ مثنویاں لکھیں یعنی قران السعدین، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خان، نُہ سپہر اور تغلق نامہ۔ تعجب یہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود چغتائی صاحب آنکھ بند کر کے لکھ رہے ہیں:

"(۲۹۵) ناصر خسرو (۱۰۰۴ء۔۱۰۷۷ء) اسماعیلی شاعر اور سیاح۔"

- موسیقی کی صنف ترانہ کے تعارف میں چغتائی صاحب رقم طراز ہیں:

"(۴۴۶) ترانہ (فارسی) ایک قسم کا گیت۔ ایک خاص لے یا سُر۔ امیر خسرو نے گوپال نایک کے گائے ہوئے راگ میں سنسکرت کے الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ استعمال کیے اور اس صنفِ موسیقی کو ایجاد کیا۔"

اور انگریزی حاشیے کی عبارت یہ ہے:

"Persian TARANA,melody ,song;a song in a RAGA composed of simple words,usually Persian,sung in a colourful and gay melody in fast tempo.The style was initiated by Amir Khusraw as a result of a competition in the Court of Sultan Hussain Sharqi. Gopal Naek sang a RAGA and Amir Khusraw was challenged to reproduce it.He did so but not being proficient in the Sanskrit language,he replaced the Sanskrit words in the song with Persian and sang the RAGA.(BARE AGHA,P-7)."

یوں اس حاشیے کے تین راوی ہو جاتے ہیں یعنی بڑے آغا، انگریزی مترجمین اور چغتائی صاحب۔ اب خدا جانے کہ ع:

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

بہر حال حاشیہ غلط ہی نہیں غلط در غلط ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سلطان حسین شرقی والیِ جونپور (۱۴۵۸ء۔۱۵۰۰ء) سلطان بہلول لودھی اور سلطان سکندر لودھی کا معاصر ہے جن کے ساتھ اس کی معرکہ آرائیاں رہی ہیں۔ اس وقت کیا امیر خسرو (۶۵۱ھ۔۷۲۵ھ / ۱۲۰۳ء۔۱۳۲۵ء) دوسرا جنم لے کر آئے

تھے۔امیر خسرو اور گوپال نایک کا مقابلہ سلطان علاء الدّین خلجی (۱۲۹۵ء ۔۱۳۱۵ء) کے دربار میں ہوا تھا۔خدا کا شکر ہے کہ چغتائی صاحب نے کو اِس فاحش غلطی کی تصحیح نہیں کی تاہم اتنا تو کیا کہ سلطان حسین شرقی کا نام اپنے حاشیے سے نکال دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مقابلہ ترانہ کی صنف میں نہیں ہوا تھا بلکہ دُھرپد میں جو اس قدیم دور میں راگ داری کی مروّجہ اور مقبول صنف تھی۔دُھرپد میں نہ صرف اُس وقت بلکہ آج بھی سنسکرت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔امیر خسرو نے اُن کی جگہ فارسی الفاظ برت کر گوپال کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔یہ بھی یاد رہے کہ ترانہ جب امیر خسرو کی ایجاد بتایا جاتا ہے تو گوپال دکن سے یہ صنف اپنے ساتھ کس طرح لے آیا تھا؟ترانہ کو ''خاص لے یا سُر'' کہہ کر اِس کے تعارف کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔اِس کی اصل شناخت لے کی تیزی ہے جس کی طرف انگریزی حاشیے میں "fast tempo" کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔یہ لے اتنی تیز ہوتی ہے کہ اِس میں کسی زبان کے الفاظ بھی ادا کرنا ممکن نہیں۔نہ سنسکرت نہ فارسی نہ برج۔اِسی دقّت کے باعث اِس کے موجد حضرتِ امیر نے کچھ مختصر آوازیں مقرر کی تھیں جو معنی کے اعتبار سے مُہمل ہوتی ہیں جیسے تانانا'دیرے نا'دھیم تا'تا دھوم'یلالوم وغیرہ اور ان میں ردّو بدل سے مختلف راگوں کے ترانے باندھے اور گائے جاتے ہیں۔موسیقی کے بارے میں دیے گئے حواشی میں اور بھی بہت سی غلطیاں ہیں تاہم میں بخوفِ طوالت اُن سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

■ قورمہ پر مرتّب نے حاشیۂ ذیل دیا ہے:

''(۴۸۳)قورمہ'بھنا ہوا گوشت جس میں ہلدی اور ترکاری وشوربہ(؟شوربا)نہیں ہوتا۔صرف گھی اور مسالے پر چھوڑتے ہیں۔لکھنؤ میں یہ سبزی کے بغیر تیار کیا جاتا ہے۔''

آخری جملہ انگریزی حاشیے میں بھی موجود ہے:

"In Lucknow it is prepared without vegetables."

قورمہ بھی بہت سے دوسرے کھانوں کی طرح دہلی سے لکھنؤ پہنچا تھا۔وہاں اِس میں کوئی قابلِ ذکر ترقّی نہیں ہوئی قورمے میں گوشت اور مسالوں کے علاوہ کوئی دال یا سبزی ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔اِس لیے یہ کہنا کہ لکھنؤ میں یہ سبزی کے بغیر پکایا جاتا تھا'قارئین کی غلط فہمی کا موجب ہوگا۔

(ہ)انگریزی حروف سے غلط فہمی

عام فہم بات ہے کہ اردو زبان کی بعض آوازیں انگریزی حروف میں ادا نہیں کی جا سکتیں لہٰذا اِن کو قریب ترین حرف سے تحریر کیا جاتا ہے اور اِن کی پہچان کے لیے سُوجھ بُوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چغتائی صاحب نے عدم توجہ کی بنا پر اِس معاملے میں بھی بے اعتدالیاں کی ہیں اور بعض الفاظ کو مسخ کر دیا ہے۔دو ایک مثالیں دیکھیے:

■ ''(۴۴)معاہدہ الہ آباد کے بعد شاہ عالم کی جانب سے ذوالفقار الدولہ اور نجف خاں کورہ اور الہ آباد کے انتظامی امور کے ذمّہ دار تھے......۔''

صحیح نام کوڑا'یا کوڑا ہے جسے چغتائی صاحب نے انگریزی کی پیروی میں کورہ لکھا ہے۔کوڑا'الہ آباد کے صوبے کا پرانا نام ہے اِس لیے کوڑا الہ آباد کہلاتا ہے۔اِن کے درمیان حرفِ عطف ''اور''غیر ضروری ہے۔چغتائی صاحب اُنہیں دو علاقے فرض کر رہے ہیں اور شاید اسی مناسبت سے ان کے دو منتظمین کے نام بتا رہے ہیں یعنی ذوالفقار الدولہ اور نجف خاں۔یہ دو اشخاص نہیں بلکہ نجف خاں کا خطاب ہی ذوالفقار الدولہ تھا۔ان کے درمیان ''اور'' بھی ناواجب ہے۔انگریزوں نے صوبجاتِ متّحدہ آگرہ و اَودھ (یو۔پی) میں مغلیہ دور کے جو صوبے شامل کیے تھے اُن میں آگرہ اور اَودھ کے علاوہ کوڑا الہ آباد اور روہیلکھنڈ کے نام داخل ہیں۔

■ اس کے برخلاف حاشیہ(۸۷) میں لکھتے ہیں:

''کتری:ایک ذات جس کے افراد دستی کام کاج کرتے تھے۔''

یہ لفظ کٹاری (کٹاریہ) ہے۔انگریزی میں Katari لکھا دیکھ کر مرتب نے اِسے ''کتری'' سمجھ لیا۔متن کے صفحہ ۶۴ پر صاف ''کٹاری ٹولہ'' درج ہے۔

■ یہی سلوک حاشیہ (۹۰) میں لفظ ''ٹولہ'' (بمعنی بستی، آبادی، محلّہ) کے ساتھ کیا گیا ہے یعنی اسے ''تولہ'' لکھا ہے جو دراصل ایک وزن کا نام ہے۔تولہ،بستی یا آبادی کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوتا۔ٹولہ کی ترکیب کے ساتھ مختلف شہروں میں محلّے پائے جاتے ہیں جیسے ملّاحی ٹولہ،بڑھئی ٹولہ،بہشتی ٹولہ وغیرہ۔

(و) انگریزی الفاظ و محاورات کا غلط ترجمہ

چغتائی صاحب کے درج کردہ حواشی میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ وہ جابجا انگریزی الفاظ و محاورات کے ترجموں میں غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انگریزی زبان سے نابلد ہیں لیکن یہ اُن کی غفلت اور عجلت کا شاخسانہ ہے جس سے بعض اوقات بڑی استہزائی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

■ میواتی پر یہ حاشیہ ملتا ہے:

''(۴۷) میو کی ایک راجپوت ذات جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔''

اِس میں چغتائی صاحب نے گھوڑے کے آگے گاڑی جوتی ہے۔میو جُز ہے اور راجپوت کُل۔''راجپوتوں کی ایک ذات،میو ..... '' درست ہوتا۔دراصل وہ انگریزی جملے کا مفہوم نہیں سمجھ سکے جو یوں ہے:

"47.A Rajpoot caste of meos who were converted to Islam,   from the area of Mewar(Punjab)."

اِس کا صریح مطلب ہے ''میو نامی ایک راجپوت ذات......'' تاہم میواتیوں کا میواڑ سے اور میواڑ کا پنجاب سے کیا واسطہ؟ شکر ہے چغتائی صاحب نے یہ حصّہ حذف کر دیا ''گو تصحیح بھی نہیں کی۔بات صرف اتنی تھی کہ Mewat کی ''ٹی'' کی جگہ ''آر'' چھپ گیا تھا۔

■ کتاب کے صفحہ ۹۷ پر قیصر باغ (لکھنؤ) کی باقیات کے تحفظ کے ضمن میں بتایا گیا

ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد ان آثار وعمارات کو اس شرط پر مختلف تعلقہ داروں کی تحویل میں دے دیا گیا تھا کہ وہ ان میں کوئی نمایاں ردّوبدل کیے بغیر قیام کریں اور ان کی حفاظت کریں۔ اس پر یہ انگریزی حاشیہ دیا گیا:

"212. The requirement to maintain the houses applies to this day."

جس کا مطلب ہے کہ "یہ شرط آج بھی برقرار ہے۔" لیکن چغتائی صاحب فرماتے ہیں:

"(۲۱۲) گھروں کی دیکھ بھال کی ضرورت کا احساس اب بھی موجود ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ جملہ انگریزی عبارت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

■ بٹیر بازی کے ضمن میں شرر نے یہ جملہ لکھا تھا:

"بٹیروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک گھاگس اور دوسری چننگ...... ۔" (صفحہ ۱۶۸)

اس پر انگریزی مترجمین نے درج ذیل حاشیہ دیا:

"396. In fact there are many varieties of quail in India but bush quail and button quail are the best known."

اس حاشیے کا ترجمہ چغتائی صاحب یوں کرتے ہیں:

"(۳۹۶) برصغیر میں کوئل کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں لیکن زیادہ تر یہی دو مشہور ہیں۔"

پتہ نہیں یہ بٹیروں کی لڑائی میں کوئل کہاں سے ٹپک پڑی۔ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فاضل مرتب نے بٹیر کے لیے انگریزی لفظ کوئیل (Quail) کو کوئل سمجھ لیا۔

■ رقص کے سلسلے میں حاشیۂ ذیل بزبانِ انگریزی ملتا ہے:

"459. In Indian dance a collection of small bells is frequently worn on a band round the ankles by male and female dancers alike."

اور چغتائی صاحب فرماتے ہیں:

"(۴۵۹) ہندوستانی رقص میں ناچنے والے مرد اور عورتیں اپنے گھٹنوں میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ لیتے ہیں...... ۔"

گویا ankle انگریزی زبان میں ٹخنے کو نہیں گھٹنے کو کہا جاتا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ ایسے ہی موقعوں پر بولتے ہیں۔

■ کباب پر انگریزی حاشیے کا پہلا فقرہ ہے:

"485.KABAB is prepared in Lucknow from finely ground meat,....."

اردو حاشیے میں اس کا ترجمہ یوں ملتا ہے:

"(۴۸۵) لکھنؤ میں کباب بڑے عمدہ قیمے سے تیار کیے جاتے تھے...."

"finely ground" کے معنی ہیں "باریک پسا ہوا" چغتائی صاحب عجلت میں "عمدہ قیمہ" لکھ گئے۔

■ شرر نے لکھنؤ میں مروجہ جوتوں کے تذکرے میں یہ جملہ لکھا تھا:

"چمڑے کے استعمال سے ہندو لوگ مذہباً احتراز کرتے تھے۔" (صفحہ ۲۴۳)

اس پر انگریزی مترجمین نے یہ حاشیہ دیا تھا:

"508.The cow from which the hide is obtained is of course a sacred animal for Hindus."

چغتائی صاحب نے یہ حاشیہ ان لفظوں میں دیا ہے:

"(۵۰۸) ہندوؤں کے ہاں ایسی گائے مقدس ہے جس سے ہڈیاں حاصل ہوتی ہیں۔"

اس حاشیے کی مضحکہ خیزی بغیر کچھ کہے عیاں ہے۔ گویا ایسی گائیں بھی ہوتی ہیں جن میں ہڈیاں نہیں ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب میں ہر قسم کی گائے مقدس سمجھی جاتی ہے خواہ ہڈی والی ہو یا بغیر ہڈی کی، حتیٰ کہ نیل گائے بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے انگریزی لفظ "hide" بمعنی کھال کو "ہاڈ" سمجھ کر اس کے معنی ہڈیاں کر دیے ہوں۔

■ مصنف نے "صحبت" سے موسوم محفلوں کے ذکر میں پُتلے بنائے جانے اور ان کے جلائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس پر درج ذیل انگریزی حاشیہ ملتا ہے:

"540. In fact the custom is simply to burn the effigies and make derogatory remarks."

چغتائی صاحب کا ترجمہ یوں ہے:

''(۵۴۰) ایسے مجسموں کو جلا دیا جاتا ہے اور ان کے متعلق نازیبا کلمات استعمال کیے جاتے ہیں۔''

پُتلے اور مجسمے میں فرق ہوتا ہے۔یہاں صورتِ حال کی مناسبت سے effigy کا ترجمہ مجسمہ ناموزوں ہے۔مناسب ترجمہ پُتلا ہی ہے۔کسی سے اظہارِ نفرت کے لیے اُس کا پُتلا جلایا جاتا ہے، اہتمام سے مجسمہ تیار کرا کے نذرِ آتش نہیں کیا جاتا۔

(ز) متفرق اغلاط

ذیل میں حواشی میں در آنے والی متفرق قسم کی اغلاط کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

- ''(۱۰) خان کا لفظ بطور اعزازی خطاب بھی مستعمل رہا ہے جیسے احمد خان بنگش۔''

بے شک ''خان'' کا استعمال بطور اعزازی خطاب بھی استعمال ہوتا رہا ہے لیکن احمد خان بنگش کی مثال درست نہیں۔نواب فرخ آباد احمد خان بنگش پٹھان روہیلہ سردار تھے اور خان کا لفظ اُن کے نام کا جزو تھا نہ کہ خطاب۔

- حاشیہ نمبر ۱۸ لفظ ''دیوان'' پر ہے۔چغتائی صاحب نے اس کے مختلف معانی لکھتے ہوئے آغاز ''شاعرِ دربار'' سے کیا ہے۔معلوم نہیں کہ یہ معنی اُنھوں نے کس لغت میں دیکھے ہیں بہرحال دیوان سے یہ معنی کبھی مراد نہیں لیے گئے۔انگریزی حاشیہ دیکھنے سے پتہ چلا کہ وہاں اِس مقام پر ''royal court'' درج ہے جس کا مطلب شاہی دربار ہے نہ کہ ''شاعرِ دربار''

- لفظ کمبوہی پر یہ حاشیہ دیا گیا ہے:

''(۳۵) ایک عرب قبیلہ جس کے جدِ اعلیٰ عبداللہ بن زبیر ہیں۔اِسی وجہ سے اُنھیں زبیری بھی کہا جاتا ہے۔''

کمبوہی نسبت ہے کمبوہ (کنبوہ) سے۔ یو۔پی کے کنبوہ زبیری ضرور کہلاتے ہیں تاہم بہتر ہوتا اگر چغتائی صاحب اس وثوق کے ساتھ یہ حاشیہ نہ دیتے۔مختلف برادریوں کے دعاوی کو یوں آنکھ بند کر کے قبول کر لینا ایک محقق کو زیب نہیں دیتا۔

■ "(۴۵)ثابت خاں'افغانستان کے ایک قبیلے کا سردار تھا۔"

یہ حاشیہ "ثابت خانی" نسبت پر ہے لیکن اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ثابت خاں کا تعلق کس قبیلے سے تھا اور اُس کا علاقہ یا زمانہ کونسا تھا۔یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہہ دینا کہ ثابت خاں حضرت آدم کی اولاد میں تھا۔غرض ثابت خاں کا کوئی تاریخی وجود نہیں۔ممکن ہے روہیل کھنڈ کے آباد کاروں میں اِس نام کا کوئی پٹھان ہو جس کی اولاد اپنی پہچان کی خاطر ثابت خانی کہلانے لگی۔بہر حال ایسے گول مول حواشی کی تحقیق کے کام میں کوئی گنجائش ہے نہ اہمیت۔

■ حاشیۂ ذیل "چندیلہ" پر ہے:

"(۴۶)ایک راجپوت گوت جو بندیل کھنڈ میں آباد تھی۔اسی علاقے کے بھنگیوں کا ایک قبیلہ جو جنگ وجدل میں مہارت رکھتا تھا۔"

اِس حاشیے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ چندیلے دراصل راجپوت تھے یا بھنگی؟

■ "(۱۰۹)چوتھ۔مرہٹوں سے لیا جانے والا ٹیکس۔یہ سالانہ آمدنی کا ایک چوتھائی ہوتا تھا۔"

چوتھ وہ خراج تھا جو مرہٹے اپنے ممالکِ محروسہ سے وصول کرتے تھے۔چغتائی صاحب اُلٹی بات کر رہے ہیں۔اگر وہ متعلقہ انگریزی حاشیے پر غور کر لیتے تو یہ غلطی نہ کرتے۔وہاں صاف لکھا ہے:

"109.The Levy imposed by the Marathas."

■ غرارہ خواتین کا معروف زیر جامہ ہے جو عموماً غین مفتوح سے تلفظ کیا جاتا ہے لیکن اس کی عربی اصل میں غین مکسور ہے۔غرارہ کسی بوری یا بڑے تھیلے کو کہتے ہیں چونکہ

اِس لباس کا نچلا حصہ بہت کشادہ ہوتا ہے اس لیے یہ نام دیا گیا۔ اِسی بنا پر اسے غرارے دار پائجامہ بھی کہہ دیا جاتا ہے جس کا لفظی انگریزی ترجمہ ''baggy trousers'' ہوگا۔ بہر حال انگریزی مترجمین نے ''غرارہ'' پر حسب ذیل مختصر حاشیہ دیا تھا:

"507.Similar to an ankle-length skirt and at present a popular form of ladies,dress in Lucknow."

اِس کے باوجود چغتائی صاحب غرارے پر دیے گئے اپنے حاشیے میں فرماتے ہیں:

''(۵۰۷) غرارہ: ایک قسم کا پیرہن جو زرہ کے نیچے پہنتے ہیں اور جو بہت ڈھیلا ہوتا ہے۔''

اِس پر اِس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟ ع کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

(ح) بے سروپا حواشی

چغتائی صاحب کے مرتبے میں متن کی عبارت پر نشانات کے حامل الفاظ اور اصل حواشی میں عدم مطابقت پائی جاتی ہے یعنی حاشیے کا نمبر کسی اور لفظ پر دیا گیا ہے اور حاشیے میں کسی غیر متعلق موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:

- متن کے صفحہ ۵۴ پر حاشیہ (۷) کا نشان رامائن کے موئف والمیک پر ہے تاہم اصل حاشیہ لفظ ''آباؤ'' پر ملتا ہے۔
- صفحہ ۵۷ پر حاشیہ کا نشان (۳۴) لفظ گوشائیں پر لگایا گیا ہے اور حاشیہ ''برہمن'' کے بارے میں، جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''(۳۴) برہمن: ابتدا میں اِس سے ایسی الہامی کتابیں مراد تھیں جن میں قربانی دینے کے طریق کار اور ہدایات درج ہوتی تھیں ...... الخ۔''

اِس تین سطری حاشیے میں گوسائیں کا نام تک نہیں آیا۔ گسائیں (گو سائیں) کے لفظی معنی گایوں کو پالنے اور ان کی خدمت کرنے والا ہے۔ ہندو سنتوں اور سادھوؤں کو

احتراماً اِس لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ برہمنوں کی ایک گوت بھی اِس نام سے موسوم ہے۔

■ صفحہ ۸۴ پر حاشیے کا نمبر (۱۶۸) ''فرنگی محل کے علما'' پر ثبت ہے لیکن اِس نمبر کا حاشیہ اِس طرح شروع ہوتا ہے:

''(۱۶۸) شیعہ مجتہدین کا خاندان' جس کے جدِ اعلیٰ مولوی دلدار علی تھے......الخ۔''

ایک پُر لطف بات یہ ہے کہ انگریزی حاشیے میں مولوی دلدار علی کے نام کے آگے غلطی سے GUFRAMAB تحریر تھا۔

چغتائی صاحب اِسے سمجھ نہ پائے اور اپنے حاشیے سے اسے نکال دیا۔ دراصل یہ ''غفران مآب'' تھا جو مولوی دلدار علی مجتہد کے نام کے ساتھ بطور القاب آتا تھا۔

■ حاشیہ (۳۹۰) برات کے جلوس پر ہے۔ تاہم متن میں اِس کا نشان کہیں نظر نہیں آتا۔

■ مصنف نے لکھنؤ کے مکانات کے ذکر میں یہ جملہ لکھا تھا:

''اکثر مکان میں نیچے اور ہر جگہ ایسی حکمت اور خوش اسلوبی سے یکدرے' کمرے اور کوٹھریاں نکالی جاتی ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔'' (صفحہ ۲۵۶)۔

لفظ ''نیچے'' کا اشارہ تہ خانے کی طرف تھا اِس لیے اِس پر یہ انگریزی حاشیہ دیا گیا:

"514. This part of the house was the coolest and served mainly as a rest room during the heat of the day."

چغتائی صاحب نے حاشیہ کا نشان (۵۱۴) تو لفظ ''نیچے'' پر برقرار رکھا لیکن حاشیہ یہ دے ڈالا:

''(۵۱۴) کوٹھی: وہ پکا مکان جس میں چند کمرے اور کمروں میں ہوا آنے کے لیے چند جانب دروازے ہوں۔''

(ط) مزید مطالعے کے لیے انگریزی کتابوں کے حوالے

چغتائی صاحب نے مختلف شخصیات بالخصوص شاعروں اور ادیبوں پر حواشی میں اپنے مآخذ کے طور پر یا پھر مزید مطالعے کے لیے انگریزی زبان کی تالیفات کے حوالے دیے ہیں۔ انگریزی مترجمین کی تو یہ مجبوری تھی کہ اُن کے قارئین اردو زبان کی تصنیفات سے مستفید

نہیں ہو سکتے تھے تاہم چغتائی صاحب کے قارئین تو اردو خواں لوگ تھے اور اردو و فارسی شعر و ادب پر بنیادی کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں ۔چغتائی صاحب نے جہاں جہاں اردو کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ بھی انگریزی مترجمین کے حواشی کی پیروی کا شاخسانہ ہے اور بس ۔مجھے ایک بھی مقام ایسا نہ مل سکا جہاں چغتائی صاحب نے اپنے طور پر کوئی اردو کتاب دیکھنے کا مشورہ دیا ہو۔ چنانچہ:

- حاشیہ (۱۹۵) میں اردو غزل کے بارے میں مطالعے کی غرض سے ڈیوڈ میتھیوز اور کرسٹوفر شیکل کی (An Anthology of Urdu love lyrics) دیکھنے کی صلاح دی ہے۔
- حاشیہ (۴۳۵) میں اردو ادب کی تاریخ کے لیے ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ”A History of Urdu Literature“ دیکھنے کی سفارش کی گئی ہے ۔
- حاشیہ (۴۸۲) میں غالب پر مطالعے کے خاطر تین انگریزی کتابوں کے نام درج کیے ہیں ۔
- سودا کے بارے میں تفصیلات کے لیے رالف رسل اور خورشید الاسلام کی تالیف ”Three Mughal Poets“ کا نام لیا گیا ہے۔
- اکثر اردو اہلِ قلم کے مختصر تعارف پر مبنی حواشی کے بعد رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف کا حوالہ ملتا ہے۔
- اِسی طرح فارسی شاعروں اور ادیبوں کے تعارفی حواشی کے آخر میں براؤن اور لیوی کی تالیفات کے حوالے ہیں ۔

غرض وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی شعرو ادب کے موضوع پر چغتائی صاحب نے ”گذشتہ لکھنؤ“ کے انگریزی مترجمین کی بڑی ثابت قدمی سے پیروی کی ہے اور خود کوئی زحمت گوارا نہیں کی ۔

(ی) ضروری حواشی سے احتراز

انگریزی ترجمے کی پیروی میں ۵۵۱ حواشی دینے کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جو حواشی کے متقاضی تھے تاہم چونکہ انگریزی مترجمین نے اُن پر توجہ نہیں دی اِس لیے چغتائی صاحب نے بھی انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ایسے تمام موضوعات کا یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں تاہم بطور مثال بعض مقامات کا ذکر مناسب رہے گا۔

جہاں تک شخصیات کا تعلق ہے اردو ادیبوں اور شاعروں فرماں رواؤں نیز انگریز کمپنی کے افسروں وغیرہ میں سے اکثر پر اچھے برے حواشی موجود ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بارے میں حاشیوں کی غیر موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔

اگر اطبا کے طبقے کو دیکھیں تو کتاب کے صفحہ ۱۳۵ پر دہلی کے نامور اطبا میں سے حکیم ارزانی، حکیم شفائی خاں، حکیم علوی خاں اور حکیم محمد شریف خاں کے اور صفحہ ۱۳۶ پر حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں کے نام آتے ہیں۔

اِن میں سے صرف حکیم اجمل خاں کے بارے میں تین حاشیے نمبر ۳۶۰، ۳۶۱ اور ۳۶۲ دیے ہیں۔ جن میں پہلا لفظ ''حاذق'' پر دوسرا طبیہ کالج (دہلی) اور تیسرا طبی ویدک کانفرنس پر ہے۔ اِن تینوں میں سے ایک بھی حکیم اجمل خاں کی شخصیت پر نہیں ہے حالانکہ یہ تمام نام ور اطبّاَ اِس قابل تھے کہ اِن پر تعارفی حواشی دیے جاتے۔

اِسی طرح لکھنؤ کے مشہور اطبا کو بھی مختصر تعارف سے محروم رکھا گیا ہے۔ صفحہ ۱۴۲ پر مشہور خطّاطوں کے تذکرے میں میر علی تبریزی، میر عماد الحسینی، آغا عبدالرشید دیلمی، حافظ نور اللہ، قاضی نعمت اللہ اور عبداللہ بیگ خطّاط کے نام درج ہوئے ہیں تاہم یہ بھی مرتّب کی توجہ سے محروم رہے۔

شخصیات سے ہٹ کر دوسری بہت سی چیزیں صراحت کی محتاج تھیں مثلاً:

- متن کے صفحہ ۱۳۱ پر یہ فقرہ ملتا ہے: ''ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک

بندو بُڑھیا کے کاتے والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا ......"

بڑھیا کا کاتا کیا چیز ہے؟ مرتّب کا فرض تھا کہ اس پر روشنی ڈالتے۔

- صفحہ ۲۱۹ پر "تورا" کے ذیل میں 'بورانی کے پیالے" کا نام آتا ہے۔مرتّب جو پلاؤ' زردہ قورمہ اور بریانی پر حاشیے دینا نہیں بھولے اُنہوں نے "بورانی" کو چھوا تک نہیں حالانکہ یہ حاشیے کی مستحق تھی۔
- صفحہ ۴۸۳ پر ایک جملہ یوں ہے :"اِسی اثنا میں اگر محرم آگیا تو دونوں جانب سے اہتمام اور تکلّف کے ساتھ کوا' الا ئچیاں' چکنی ڈلیاں اور اعلیٰ درجے کے کارچوبی اور ریشمی بٹوے سمدھیانے میں بھیجے جاتے ہیں۔"

اِس جملے پر حاشیہ (۵۳۲) دیا گیا ہے جس کے الفاظ ہیں:

"محرم کے ابتدائی دس دنوں میں شیعہ حضرات پان کھانا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔البتہ اُس کے خشک اجزا چباتے رہے۔" (؟ رہتے ہیں)

یہ حاشیہ اپنی جگہ لیکن متذکرہ بالا جملے میں کم از کم دو چیزیں ایسی ہیں جن پر حاشیے دینا ضروری تھا۔ایک کوا اور دوسرا بٹوہ۔ یہ بھی یاد رہے کہ اِس ضمن میں جن چیزوں کے نام لیے گئے ہیں وہ صرف محرم یا عاشورے سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ سارا سال استعمال میں رہتی تھیں۔

کوا جسے لکھنؤ سے باہر گنگا کہا جاتا تھا ایک قسم کا چبینہ تھا۔اِس میں باریک کتری ہوئی چھالیہ بُھنی ہوئی دھنیے کی گری (مغز کشنیز) کھوپرا' الا ئچیاں اور چکنی ڈلی شامل ہوتی تھی۔کھوپرے کا کالا چھلکا چھیل کر اتار دیا جاتا تھا اور اِس کے اندر باہر ایک جانب سرخ اور دوسری طرف سبز رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔خشک ہونے کے بعد اس کی باریک ہرنجیاں سی کاٹ لی جاتی تھیں۔یہ ایک طرف سے سرخ دوسری طرف سے سبز اور بیچ میں سے سفید ہوتی تھیں۔الائچیوں اور چکنی ڈلیوں پر چاندی سونے کے ورق چڑھائے جاتے تھے۔اِس طرح یہ رنگا رنگ گنگا تیار ہو جاتا تھا جو گویا پان کا متبادل تھا۔گنگا (کوا) لکھنؤ سے مخصوص نہیں تھا۔دہلی

'رامپور' بھوپال' ٹونک اور مسلمانوں کے دوسرے تمدّنی مراکز میں یہ ایک جانی پہچانی چیز تھی۔ بعض مقامات پر اِس میں چارمغز اور بادام وغیرہ کا اضافہ کر دیتے تھے۔

بٹوہ آج کل انگریزی پرس (purse) کو کہا جاتا ہے۔ شرر نے جس بٹوے کا ذکر کیا ہے وہ ریشمی کپڑوں اطلس' کمخواب' بناری وغیرہ سے بنائے جاتے تھے جن میں رنگوں کے امتزاج کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اِن کی شکل چاندے یعنی نیم دائرے کی ہوتی تھی۔ اس کے درمیان ایک رنگ کا کپڑا اور چاروں طرف دوسرے رنگ کا حاشیہ یا گوٹ۔ اگر کپڑا نقش و نگار سے عاری ہوتا تو بٹوے پر دونوں جانب سلمہ ستارے یا گوٹا کناری کا کام کر دیا جاتا تھا۔ اندر باریک کپڑے کی تہوں سے تین چار خانے بنا دیے جاتے تھے۔ ایک میں چھالیہ دوسرے میں تمباکو تیسرے میں کتھا یا الائچیاں وغیرہ رکھی جاتیں۔ بٹوؤں میں بڑی نفاست سے ڈورے ڈالے جاتے جن کے سروں پر بڑی خوبصورت گھنڈیاں بنی ہوتیں۔ یہ تعداد میں چار ہوتے تھے۔ دو چھوٹے ڈوروں کے کھینچنے سے بٹوہ کھل جاتا تھا اور لمبے ڈورے کھینچنے پر اِس کا منہ بند ہوجاتا تھا۔ پان کھانے کا رواج عام تھا اور اِس غرض سے پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ ہمیشہ ساتھ رکھا جاتا تھا۔ بھوپال کے بارے میں ایک عوامی تک بندی مشہور ہے:

چار چیز است تحفۂ بھوپال کتھا و بٹوہ و چنوٹی' رومال

- کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر ''بانکوں'' کا نام آیا ہے۔ یہ ادارہ ایک جامع حاشیے کا متقاضی تھا لیکن مرتب نے اِسے التفات سے محروم رکھا۔
- کتاب کے صفحہ ۲۹۱ پر ''شہدوں'' کا ذکر ملتا ہے۔ شہدے' بانکوں کی طرح ایک جانا پہچانا ادارہ تھا۔ اِن پر ایک بھرپور تعارفی حاشیہ لکھا جانا چاہیے تھا۔

متعدد الفاظ و اصطلاحات مثلاً خدا ارحم' چھت گیری' میر فرش وغیرہ وغیرہ حواشی کے مستحق تھے۔ غرض کہاں تک ذکر کروں' مختصر یہ کہ بیسیوں مقامات چغتائی صاحب کی سہل انگاری کے باعث حاشیوں سے محروم رہ گئے۔

صفحاتِ بالا میں "گذشتہ لکھنؤ" کے متن پر دیے گئے مرتب کے فراہم کردہ حواشی کے جائزے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اِن میں ہر قسم کی اغلاط روا رکھی ہیں۔ اُنھوں نے تمام تر حاشیے اِس تالیف کے انگریزی ترجمے سے نقل یا اخذ کیے ہیں اور اِس میں بھی جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔

میں نے ارادی طور پر جستجو کی کہ اِن ۵۵۱ حواشی میں فاضل مرتّب کے اپنی طرف سے اضافہ کردہ اجزا کا سراغ لگاؤں۔ الحمدللہ میری سعی مشکور ہوئی اور مجھے چند ایسے حاشیے مل گئے جن پر مرتب نے ایک ایک جملے کا اضافہ کیا ہے۔ میں اِس کبریت احمر کو بطور تبرّک قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

- حاشیہ ۲۴۴، ولی گجراتی: ".....حالیہ فسادات گجرات میں ولی کا مزار مسمار کر دیا گیا۔"
- حاشیہ ۲۶۵، جرأت: ".....کلیاتِ جرأت (تین جلد) اطالیہ کے مشہور شہر نیپلز سے شائع ہو چکا ہے، جس کو ڈاکٹر اقتدا حسن مرحوم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتّب کیا تھا۔"
- حاشیہ ۳۷۸، کاتب: ".....لیکن اب کمپیوٹر کمپوزنگ کے رواج پاتے ہی کاتبوں کی تعداد خاصی کم ہوگئی ہے۔"
- حاشیہ ۴۴۲، غزل: ".....دورِ حاضر میں پاکستانی گویّوں میں مہدی حسن اور غلام علی نے غزل گانے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔"
- حاشیہ ۴۶۲، تال: ".....گویّوں میں ساڑھے بارہ تالیں مشہور ہیں۔"

(IV)

"گذشتہ لکھنؤ" کے منتخب تنقیدی اور تحقیقی مطالعات کے لیے الگ حصّہ مختص ہے اور یہ معتبر ناقدین اور محققین کی گہری نظر کی غمازی کرتے ہیں۔"

الگ حصّہ تو ضرور مختص ہے تاہم جس کتاب کو چغتائی صاحب مرتّب کر رہے ہیں

۔اِس کے بارے میں اُنہوں نے اپنی طرف سے کچھ اظہار خیال نہیں کیا۔اِس حصّے میں، جیسا کہ اِس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا جا چکا ہے، گذشتہ لکھنؤ کے تین سابقہ ایڈیشنوں کے مرتّبین یعنی رشید حسن خاں، غضنفر امروہوی اور شمیم انہونوی کے تحریر کردہ دیباچوں کو نقل کردیا گیا ہے اور بس۔ اِس صورتِ حال میں اِن کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

(V)

''۵۔عبدالحلیم شرر کے سوانح حیات اور تصنیفات کے متعلق کچھ ایسے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے اُن کی شخصیت کی تفہیم اور اردو ادب کی ترویج وترقی میں اُن کی بلند پایہ خدمات کا بخوبی علم ہو جائے گا۔اِس حصّے کے دو مضامین خصوصی توجہ کے مستحق ہیں، اِن میں ایک تو ڈپٹی نذیر احمد کے فرزند مولوی بشیر احمد دہلوی کا مضمون ہے، جو اُنہوں نے اپنے دیرینہ دوست کی وفات پر رقم کیا تھا اور اِس سے شرر کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔دوسرا مضمون عبدالرؤف عشرت کا تحریر کردہ ہے، جو لکھنؤ کے تہذیبی آثار کو اجاگر کرنے والے ابتدائی لکھاریوں میں سے ہیں۔''

فاضل مرتبنے اِس حصّے میں بھی پانچ اہلِ قلم کے مضامین یکجا کرنے پر اکتفا کی ہے اور گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کا لائحۂ عمل اختیار کیا ہے۔چونکہ اُنہوں نے تصنیف کی طرح مصنّف کے بارے میں بھی اپنی رائے محفوظ رکھی ہے اِس لیے ہمیں بھی اِس بارے میں کچھ عرض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(VI)

''۶۔''گذشتہ لکھنؤ'' میں ایسے الفاظ ومحاورات بھی استعمال ہوئے ہیں، جو اب متروک ہو چکے ہیں یا قلیل الاستعمال قرار دیے جاتے ہیں۔ایسے الفاظ وغیرہ کی ایک فرہنگ دی گئی ہے تاکہ عام قارئین کے لیے متعلقہ عبارتوں کا مفہوم واضح ہوجائے۔ اِس فرہنگ کی تیاری میں

میرے دیرینہ محبّ اور زبان شناس محمد سلیم الرحمٰن صاحب نے بھی ماہرانہ اعانت فرمائی۔"

یہ فرہنگ کتاب کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اِس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اِس میں دیے گئے الفاظ کے آگے متن کا متعلقہ صفحہ نمبر درج نہیں کیا گیا۔اِس سے یہ دقّت پیدا ہوتی ہے کہ لفظ کو اُس کے سیاق وسباق میں دیکھنے کے لیے پوری کتاب کھنگالنی پڑتی ہے۔

ایک لفظ کے مختلف معانی ہو سکتے ہیں اور اِس چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مصنف نے یہ لفظ کس تناظر میں استعمال کیا ہے اور اِس خاص مقام پر اِس کے کونسے معنی مراد لیے ہیں۔کسی کتاب کی فرہنگ اور عمومی کتبِ لغت میں یہی چیز ما بہ الامتیاز ہوا کرتی ہے۔چغتائی صاحب نے اِس فرہنگ میں جس علمی معیار کا مظاہرہ کیا ہے وہ اُن کی حاشیہ نگاری سے کسی طرح بہتر نہیں ہے اور یوں یہ سوءِظن پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کے آگے متعلقہ صفحات کے نمبر درج نہ کرنا ایک شعوری عمل ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن صاحب کو چغتائی صاحب نے ناحق بدنام کیا۔میں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اغلاط کی یہ کھتونی یعنی فرہنگِ "گذشتہ لکھنؤ" محمد سلیم الرحمٰن صاحب جیسے بالغ نظر شخص کی "ماہرانہ اعانت" سے تیار کی گئی ہے۔اگر ایسا ہوتا تو اِس میں موجود فاحش اغلاط ہرگز نہ پائی جاتیں۔

اب میں فرہنگِ ہٰذا کا سرسری جائزہ لے کر اِس کی چیدہ چیدہ اغلاط ترتیب وار ذیل میں درج کرتا اور حسبِ موقع اپنی رائے سے قارئین کو مطلع کرتا ہوں:

- "اَتو کرنا: کپڑے پر زینت کے لیے نقش بنانا۔"

اَتو نقش کی اُس خاص قسم کو کہتے ہیں جسے اردو میں چُنٹ،سلوٹ،جُھرّی اور جھول کہا جاتا ہے۔اَتو کرنا کپڑے میں ٹانکے دار پلیٹیں ڈالنا ہوتا ہے جسے انگریزی میں smocking کہتے ہیں۔تاہم اَتو کرنے کے ایک مجازی معنی کسی کو مار مار کر نیل ڈال دینے کے بھی ہیں اور وہی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ذکر ہے بٹیروں کی لڑائی کا اور مصنف کے الفاظ یہ ہیں:

"بٹیر کی لڑائی مرغ سے ملتی ہوئی ہے۔چونچ سے کاٹتا اور پنجوں سے لات مارتا ہے۔ چونچ سے حریف کے منہ کو زخمی اور اتّو کر دیتا ہے۔"(صفحہ ۱۶۹)۔

اب ظاہر ہے کہ یہاں اتّو کرنے سے مراد کھرونچے مارنے اور خراشیں ڈالنے سے ہے ورنہ بٹیر ایک دوسرے کے کپڑوں پر نقش و نگار تو بنانے سے رہے۔

■ "اوگھی: وہ لمبی رسّی جس کو گھوڑا نکالنے اور سدھانے کے وقت اس کے پیچھے پھٹکارتے ہیں۔"

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ مصنف کی اوگھی سے کیا مراد ہے:

"اوگھی کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑوں کو کہا جاتا ہے جو زنانے یا مردانے جوتوں پر لگائے جاتے ہیں ۔"(صفحہ ۲۴۶)

اِن دونوں معنوں میں فرق پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

■ "بالابر: انگرکھے کا وہ حصہ جو آگے کی کلی سے نکلا ہوتا ہے اور دامن کے نیچے چھپا رہتا ہے۔"

یہ معنی صحیح نہیں کہے جا سکتے ۔بالابر کے بارے میں مصنف نے جو کچھ بتایا ہے اُس پر مرتب نے خود ذیلی عنوان "بالابر" دیا ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالاپوش کی ایک قسم ہے۔اِس کے تعارف میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"اِس کے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے بالابر ایجاد ہوا...... ۔"(صفحہ ۲۴۷)۔پھر اِس کی قطع کے تذکرے کے بعد یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ "بالابر بھی دہلی ہی کی ایجاد ہے ......اِسی بالابر پر ترقی کر کے دہلی ہی میں انگرکھا ایجاد کیا گیا۔"(صفحہ ۲۴۸)۔

بعد ازاں چپکن اور اچکن کا ذکر آتا ہے اور آخر میں شروانی (شیروانی) کا۔گویا جامہ‘ قبا‘ بالابر‘ انگرکھا‘ چپکن اور اچکن یہ سب شیروانی کی ارتقائی کڑیاں ہیں۔

■ "بجھرا: ایک خاص وضع کا سرپوش جس کو گھوڑوں پر رکھتے ہیں ۔"

یہ صراحت ناکافی ہے ۔یہ کہنا مناسب ہوتا کہ: مٹی کا ایک سبک سرپوش جس کو گھڑوں پر رکھتے اور پانی پیش کرتے وقت آبخوروں پر ڈھکتے ہیں۔مصنف نے مختلف مقامات پر یہ دونوں استعمال بتائے ہیں ۔

■ ''بعقہ :عربی بمعنی دراڑ۔''

یہ لفظ مجہول اور معنی مغلوط ہیں ۔مجھے تلاش کے باوجود کتاب میں 'بعقہ''نظر نہیں آیا۔ممکن ہے ''بقعہ'' ہو جسے ''بعقہ'' لکھ کر ایک فرضی معنی دے دیے گئے ۔صفحہ ۱۱۱ پر یہ عبارت ملتی ہے۔''وہی بقعہ جو چند روز میں باغِ اِرم بن گیا تھا'حضیض ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔''

■ '' بکیاں : پنجابی میں دکھیاں۔''

کتاب میں اِس لفظ کا وجود بھی مشکوک ہے۔خدا جانے مرتّب کی اِس سے کیا مراد ہے؟

■ '' بلاق: زیور جس کو عورتیں ناک میں پہنتی ہیں ۔''

یہاں یہ صراحت درکار تھی کہ بلاق 'ناک کے دوسرے زیوروں بیسر 'نتھ'نتھنی اور لونگ کی طرح ناک کے نتھنے میں نہیں بلکہ دونوں نتھنوں کے درمیانی پردے کو چھید کر پہنا جاتا ہے۔

■ ''پُھنک مارنا:گھوڑے کی (؟کا)دولتّی پھینکنا۔''

پُھنک کے مختلف معنی ہیں جن سے یہاں سروکار نہیں ۔ہماری تمام اردو لغاتوں میں پُھنک مارنا'دولتّی مارنے یا جھاڑنے (پھینکنے نہیں) کے مترادف بتایا گیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ گھوڑے'گدھے وغیرہ کی دولتّی اور پُھنک میں فرق ہوتا ہے۔دولتّی پیچھے کی طرف موجود شے کو ماری جاتی ہے ۔پُھنک وہ حرکت ہے جو رہوار اپنی پیٹھ (پشت)پر سواری کرنے والے کو گرانے کے لیے استعمال کرتا ہے ۔اِس غرض سے وہ ایک دم اُچھلتا ہے اور پشت کو زور سے جھٹکا دیتا ہے جس کے نتیجے میں سوار غیر متوازن ہو کر زمین پر آرہتا ہے۔یہ بھی خیال رہے کہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھا ہوا شخص اُس کی دولتّی کی زد سے باہر ہوتا ہے ۔دولتّی مارنے کے لیے

صحیح فارسی مصدر ''جفتک زدن'' یا ''جفتہ زدن'' ہے اور ''پُھنک زدن'' کا درست اردو ترجمہ ''کاندھی دینا''۔سودا ''در ہجوِ اسپ'' میں کہتے ہیں:

فلک نے چھین کے گھوڑا جو مجھ کو گھوڑی دی
جو مثلِ بخت نگوں ہے پٹکنے کے درپے
سوار ہو کے جو آقا کے کام کی خاطر
کروں ہوں لات تو پُھنک ہے اور کاندھی ہے

اردو لغت (جلد ۱۴ صفحہ ۵۹۶۔۵۹۵) میں کاندھی دینا کے معنی یوں لکھے ہیں: ''گھوڑے کا......گردن جھکا کر پُھنک مارنا اور پیٹھ سے جھٹکا دینا تاکہ سوار گر پڑے۔'' ساتھ محبّ کے مرثیہ کا یہ شعر بھی درج ہے:

ہو کے ترچھا کبھی چلتا ہے کبھی رُکتا ہے
کاندھی دیتا ہے کبھی اور کبھی جُھکتا ہے

مصنف نے پُھنک اِنہی خاص معنی میں استعمال کیا ہے۔موقع ہے ایک گھوڑے اور شیر کی لڑائی کا۔متن کی عبارت دیکھیے:

''جیسے ہی شیر جست کر کے اُس پر آیا اُس نے اِس طرح اگلا جسم جُھکایا کہ شیر پشت پر گرا......ساتھ ہی گھوڑے نے اِس زور سے پُھنک ماری کہ شیر قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا'' (صفحہ ۱۹۰)

■ ''پَھکی: وہ گُٹھی جو خشک سفوف کے گھولنے میں پڑ جاتی ہے۔ایک چھوٹا سا پرندہ۔''

یہ دونوں معنی یہاں بے محل ہیں۔مرتّب پُھکی کی ''پھ'' پر پیش سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ زبر کے ساتھ پَھکی ہے جس کے معنی چڑی مار کے جھولے یا پنجرے کے ہیں۔متن کی عبارت ذیل سے 'جو بٹیر پکڑنے کے سلسلے میں ہے' میری بات کی وضاحت ہو جائے گی:

''......صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھگائے جاتے ہیں جس میں پھنستے ہی پکڑ پکڑ کر پھکیوں میں بند کر لیے جاتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۷۰)۔

- پھڑ وے: بھاوڑے (؟پھاوڑے)' کپڑے کے پھٹے کپڑے۔"

یہ نہیں بتایا گیا کہ کتاب میں یہ لفظ دونوں میں سے کس معنی میں لایا گیا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۷ پر درج ذیل فقرہ ملتا ہے: "مزدور پھڑوے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے۔" لہٰذا دوسرے معنی دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

- "تلنگہ: وہ انگریزی سپاہی جسے انگریزی پوشاک پہنائی جاتی ہے۔ ایک قسم کا کنکوا۔"

مرتب اپنی بات واضح نہ کر پائے۔ انگریزی سپاہی انگریزی نہیں تو کیا چینی وردی پہنے گا؟ اگر "دیسی سپاہی" لکھ دیتے تو کچھ بات بن جاتی۔ دراصل تلنگا (ت پر زیر) تلنگانہ کے باشندے کو کہتے ہیں۔ انگریز کمپنی نے سب سے پہلے کرائے کے سپاہی دکن کے علاقے تلنگانہ سے بھرتی کیے تھے اور اُنہیں وردی پہنا کر تربیت دی تھی۔ چنانچہ آگے چل کر کمپنی کے ملازم دیسی سپاہی 'خواہ اُن کا تعلق برِعظیم کے کسی علاقے سے ہو' تلنگے کہلانے لگے۔ پتنگ کی ایک قسم بھی تلنگا کہلاتی تھی تاہم مرتب کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ متن میں یہ لفظ کن معنی میں لایا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں تو یہ لال بجھکڑ والی بات ہے کہ یا تو ہاتھی ہے یا امرود۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے یہ لفظ متن میں سرے سے نظر ہی نہیں آیا۔

- "تڑا: بدمزاج' شریر' سرکش"
- "تڑے دار: اکھڑ' بدمزاج"

یہاں مرتب نے انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ دونوں لفظوں کی ٹے پر زبر سمجھ بیٹھے ہیں۔ "تڑا" "تڑ" سے اسم صفت ہے بمعنی تڑ ہانکنے والا' بک بک کرنے والا' جھکی۔ اِس کے مجازی معنی بڑبولا' لاف زن نیز سرکش اور بدمزاج کے بھی ہوتے ہیں اور "تڑے دار" تو کوئی ترکیب سرے سے ہے ہی نہیں لیکن اِس بحث کا کیا فائدہ جب کہ مصنف نے اپنی تالیف میں چند بار جو لفظ استعمال کیا ہے اُس کا حرفِ اوّل یعنی "ٹے" مضموم ہے یعنی ٹُرّا' ٹُرّے اور ٹُرّے دار۔ ٹُرّا' دانے یا ننھی سی کنکری کو کہتے ہیں اور زیرِ نظر متن میں اِنہی معنی میں

لایا گیا ہے۔ مجازی معنی اور بھی ہیں مثلاً ریز گاری یا سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا تاہم اُن سے یہاں غرض نہیں۔ اب ذرا متن کے حوالے دیکھ لیجیے جن سے میری بات کی تصدیق ہو جائے گی:

''......ایک خاص قسم کا بنا ہوا تمباکو جس کی صورت ٹُرّے دار بارود کی سی ہوتی ہے......'' (صفحہ ۳۰۲) یعنی دانے دار بارود۔

''چکنی ڈلی کے مغز کے خوشنما ہشت پہل ٹُرّے بنا دیے جاتے ہیں ......'' (صفحہ ۳۰۲) یعنی ہشت پہلو دانے۔

■ ''جھابا: گھی یا تیل رکھنے کا چمڑے کا بنا ہوا ٹونٹی دار ظرف۔''

جھابا کئی معنی میں آتا ہے۔ یہ تیل کے کُپّے کو بھی کہتے ہیں اور کڑچھی اور کُپلی کو بھی۔ تاہم اِس کا کیا علاج کہ یہ معنی متن کی متعلقہ عبارت سے پیوست نہیں ہوتے جو یہ ہے:

''خوانوں کی شان عام سوسائیٹیوں میں یہ تھی کہ لکڑی کے خوان اُن پر رنگین تیلیوں کا گنبد نما جھابا......'' (صفحہ ۲۴۳)

جھابا اُس کھلے منہ کے مخروطی ٹوکرے کو کہتے ہیں جس کے نیچے مرغیاں بند کی جاتی ہیں۔ اِسی شکل کا ایک سرپوش خوان میں رکھے ہوئے کھانوں کو ڈھکنے کے لیے باریک سرکنڈوں کی تیلیوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ تیاری سے قبل اِن تیلیوں کو آرائش کی خاطر مختلف رنگوں میں رنگ لیا جاتا تھا۔ یہاں جھابے سے مراد یہی خوان پوش ہے۔ گنبد نما سے مصنف کی مراد اُس کی مخروطی شکل ہے۔

■ ''جُھل جُھل: پتنگ کی دم۔''

جھل جھل کا ''لفظ'' عام اردو کتبِ لغات میں نہیں ملتا۔ صرف اردو لغت (کراچی) میں یہ معنی درج ہوئے ہیں تاہم یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ ''جھل جھل'' کے دونوں حصّوں پر زبر، زیر اور پیش تینوں لگ سکتے ہیں اور معنی وہی رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ پتنگ کے ساتھ لہرانے والی کاغذ کپڑے یا فیتے وغیرہ کی دم کو جھل جھل نہیں کہا جاتا۔ اِس کے لیے آب و

تاب 'جگمگاہٹ اور چکاچوند لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس قسم کے متعدد الفاظ اردو میں رائج ہیں اور سب میں چمک دمک شرط لازم ہے جیسے جھلاجھل 'جھلابور 'جھلا جوک 'جھلی 'جھلجھلانا' جھلجھلانا' جھلجھلا' جھلجھلاہٹ وغیرہ۔ کتاب کے متن پر غور کرنے سے میری گذارش کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

دراصل تکل نے قندیل (آکاس دیا) یا روشن پتلا اُڑانے کا رواج اُٹھادیا تھا' جس کی روشنی صرف رات کونظر آتی تھی۔ پتنگ دن کو بھی اڑائی جاسکتی تھی لیکن اس میں روشنی کا لطف نہ تھا۔ اِس کمی کو دور کرنے کے لیے لکھنؤ کے شوقین مزاجوں نے پتنگ پر سنہری رو پہلی جھالر اورطلائی مقیش کے تاروں سے آرائش کا اہتمام کیا۔ اِس کے لیے تجل تجل کی اصطلاح رائج ہوئی۔ وجہ تسمیہ یہ کہ سورج کی روشنی میں اِس جھالر اور پھندنوں کی جگمگاہٹ قندیل کی روشنی کو مات کرتی تھی۔

تجل تجل ٹھڈے کے نچلے سرے یعنی پخے کی جگہ پر چسپاں کی جاتی تھی۔ اِس سے پتنگ کا توازن بھی درست رہتا تھا۔ جب تجل تجل کا رواج اٹھ گیا تو پتا لگایا جانے لگا۔ تجل تجل اور پخے کو پتنگ کا نچلا کونا کہا جاسکتا ہے' دُم نہیں۔ متن کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اعلیٰ درجے کی تکل کا نام پتنگ مشہور ہوا جس کا ٹھڈا مرشد آبادی بانس کا ہوتا جس میں اسّی (۸۰) روپے لاگت آتی 'بیس روپے کی تجل تجل ہوتی 'دو روپے کا کاغذ اور پانچ روپے بنوائی پڑتی غرض ایک سو سات روپے میں ایک پتنگ تیار ہوتا۔" (صفحہ ۱۷۶)۔ اِسی صفحے پر ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"نواب آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کی مقیش کی تجل تجل ہوتی۔ جو لوٹ کے لاتا اُسے پانچ روپے دے کر تکل لے لی جاتی اور نہ لاتا تو بھی جہاں چاہتا تجل تجل پانچ روپے کو بیچ لیتا۔"

مطلب یہ کہ جس طرح بنارسی (زربفت) کا کپڑا پرانا ہونے پر جلا کر اُس کی چاندی

بیچ لی جاتی ہے اُسی طرح یہ طلائی منقیش کی جھل جھل بھی بیک جاتی تھی۔یاد رہے کہ جھل جھل 'جھلا جھل کا مخفف ہے اور جھلا جھل بنیادی طور پر منقیش کے کام کو کہا جاتا ہے خواہ وہ پتنگ پر ہو یا کپڑے پر۔انشا اللہ خاں کا شعر ہے:

کوکا جی دیکھو میری دو گانا پہ کیا پھبی
پشواز اُودی اور جھلا جھل کی اوڑھنی

اور شاہ حاتم کہتے ہیں:

لب تالاب ہے ایسی جھلا جھل
گویا باندھے ہیں منقیشی مسلسل

یہ دونوں شعر ''اردو لغت'' میں موجود ہیں ۔اِسی لغت میں ''جھل جھل'' بمعنی پتنگ کی دم کی دو مثالیں درج کی گئی ہیں ۔پہلی واجد علی شاہ کا شعر:

دستِ نازک سے بڑھایا تُو نے جب اپنا پتنگ
واہمہ میرا تری شکل کی جھل جھل ہو گیا

یہ اشارہ پتنگ کی چمک دمک اور آرائش و زیبائش کی طرف ہے اِس سے ''دم'' کے معنی کہاں نکلتے ہیں ؟ دوسری مثال نثر سے ہے :''اگر وہ خود پتنگ بن کر اُڑے تو میں اُس کی جھل جھل بن کر ساتھ اُڑوں ۔''یہاں بھی ''دم'' کا صریحاً ذکر نہیں ۔بس چولی دامن کا ساتھ مراد ہے جو منقیش کی سجاوٹ سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ''پتنگ کی دم'' کہہ دینے سے کپڑے کی دھجی یا کاغذ کی لمبی کترن کی طرف دھیان جاتا ہے اور اُن کو جھل جھل ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔اہلِ لغت و تحقیق کو لفظوں کے مخصوص معانی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔عمومی معنی درج کر دینے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

■ ''جیغہ:ایک مرصّع زیور کا نام جو پگڑی پر باندھا جاتا ہے'کلغی۔''

جیغہ بے شک ایک جڑاؤ زیور ہے جو پگڑی کے سامنے کے حصے پر باندھا نہیں ٹانکا جاتا تھا۔اِس کے پیچھے ایک پن لگی ہوتی تھی جسے پگڑی میں چبھو دیتے تھے۔کلغی بالکل مختلف چیز ہے۔یہ پگڑی سے اوپر نکلی ہوئی ہوتی ہے اور کمیاب پرندوں کے پروں یا ریشمی رنگین تاروں سے بنائی جاتی ہے۔

■ چڑھویں:اونچی ایڑی کی جوتی"

یہ معنی شک کے شائبے سے خالی نہیں ۔اونچی ایڑی کی جوتی کا رواج بہت بعد کی بات ہے اور یہ مغربی چیز ہے۔چڑھویں جوتے یا چڑھویں جوتی سے مراد ایسی جوتیاں ہیں جن میں ایڑی کا پچھلا حصہ تختے سے نیچے تک چُھپ جائے ۔ یہ پھڈی جوتی کی متضاد صورت ہے ۔

☆''چھپی: کپڑا چھاپنے والا'وہ کپڑا بندھی ہوئی چھڑی جس سے کبوتر اُڑاتے ہیں۔"

بے شک دونوں معنی صحیح ہیں تاہم پہلے معنی کی یہاں ضرورت نہ تھی ۔مصنف کی مراد دوسرے معنی سے ہے ۔متن کا فقرہ ہے:

''کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس مکان پر چاہتے 'چھپی کے اشارے سے بازی کرادیتے یعنی کبوتر ہوا میں قلابازیاں کھانے لگتے ۔"(صفحہ۱۷۴)

■ ''دھرُوت: امانت۔"

امانت کے علاوہ دھروت یا دھرُوت کے ایک معنی زرِ ضمانت کے بھی ہیں اور یہاں وہی مراد ہیں ۔متن کا فقرہ ہے:

''......نے دھرُوت کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اُسے ایک صوبے کی نظامت کا عہدہ دلوایا تھا۔"(صفحہ۲۶۳)

■ ''رونددپھرنا: شہر کی نگہبانی کے لیے رات کے وقت چار طرف گشت کرنا۔"

یہاں یہ وضاحت کرنا بہتر تھا کہ لفظ ''روند'' انگریزی لفظ راؤنڈ(round) کی اردو شکل ہے۔متن کا حوالہ یہ ہے:

''.....فوجوں کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے اور جابجا پہرہ دیتے۔''(صفحہ ۵۶)

- ''سرکی: ایک قسم کی گھاس کی لکڑی جس سے چک اور پال بناتے ہیں۔''

گھاس کی لکڑی یعنی چہ؟ مرتّب کی مراد غالباً پتلے سرکنڈوں سے ہے لیکن انھیں سرکی نہیں کہتے۔ سرکی' پتلے سرکنڈوں سے تیار کردہ وہ چک یا پال ہوتی ہے جو ڈھلوان چھپّروں کو ٹپکنے سے بچانے کے لیے اُن کے اوپر ڈالی جاتی ہے یا چلمن کی طرح لٹکائی جاتی ہے یا پھر زمین پر کھڑی کر کے اوٹ بنانے کے کام آتی ہے۔ متن کی عبارت یوں ہے:

''آج کل سینٹھوں' سرکیوں یا ٹاٹ کے پردوں کا جو رواج ہے' اُن دنوں نہ تھا۔''(صفحہ ۴۵۹)

- '' سمنک: گیہوں کا اندرونی حصہ جو اُبال کر نکالا جاتا ہے۔''

سمنک گندم کو اُبال کر ہرگز نہیں نکالی جاتی۔ سمنک سوہن حلوے کا جزوِ لازم ہے اور اُس کا سوندھاپن اِسی کی دین ہے۔ یہ گیہوں سے تیار کردہ خاص قسم کا نشاستہ ہوتا ہے۔ اِس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق گندم لے کر اُسے نم دینے کے بعد گیلے کپڑے میں لپیٹ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ دو تین روز میں یہ پھوٹنے لگتی ہے۔ جب سب دانے پھوٹ جاتے ہیں تو اُسے خشک کر کے پیس لیتے ہیں اور کپڑ چھن کر کے سمنک نکال لیتے ہیں۔ اُبلی ہوئی گندم کے پھوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

- ''سینٹھہ: سرکنڈا۔'' دراصل یہ لفظ سینٹھا ہے' سینٹھہ نہیں۔ متن میں یہ دو بار بصورت جمع یعنی ''سینٹھے''(صفحہ ۴۵۸) اور ''سینٹھوں''(صفحہ ۴۵۹) استعمال ہوا ہے جس کے باعث مرتّب کو مغالطہ ہوا۔

- ''شوب: دستار' دھلائی۔''

یہ لفظ مصنّف نے دھلائی کے لیے استعمال کیا ہے اِس لیے ''دستار'' لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ متن کا حوالہ ملاحظہ ہو:

''اُس وقت بہت سے لوگ ایسے تھے جو.....ایک شوب کو مہینوں تک نباہ لے جاتے

اور کپڑوں کی یہ حالت ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ آج ہی دھو کے آئے ہوں۔" (صفحہ ۲۵۹)۔

■ "غیر مخیط: جس کے دماغ میں خلل نہ ہو۔"

فاضل مرتب کے یہ معنی دینے پر اُن نیم خواندہ مولوی صاحب کی مثال یاد آتی ہے جنہوں نے ایک شاگرد کے استفسار پر ظلمات کے معنی مرغی بتائے تھے۔

خیط عربی میں دھاگے کو کہتے ہیں اور خیاط سوئی کو۔ اِسی سے خیّاط (درزی) بنا ہے۔ "ثوب مخیط" سلے ہوئے کپڑے کو کہا جاتا ہے۔ غیر مخیط کے معنی ہیں اَن سلا کپڑا۔ متن میں ساڑھی کے لیے غیر مخیط کی صفت لائی گئی ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں:

"ساری ایک غیر مخیط کپڑا اور ......غیر متمدّن زمانے کی یادگار ہے۔" (صفحہ ۲۴۹)۔

بقول مرتّب اگر ساڑھی کے دماغ میں خلل نہیں ہوتا تو کیا شلوار کے دماغ میں ہوتا ہے؟

■ "غیر ممتوعہ: وہ عورت جس سے متعہ نہ ہو سکے۔"

یہ معنی درست نہیں۔ جس عورت سے متعہ (یا نکاح) نہ ہو سکے وہ محرم کہلاتی ہے۔ غیر ممتوعہ سے مراد وہ عورت ہے جس سے متعہ نہ کیا گیا ہو جیسے غیر منکوحہ اُس عورت کو کہتے ہیں جس کا نکاح نہ ہوا ہو۔ متن کے الفاظ ہیں:

"......اگر چند کمسن لڑکیاں غیر ممتوعہ تھیں تو اِس لیے تھیں کہ بعدِ بلوغ داخلِ ممتوعات کر لی جائیں گی۔" (صفحہ ۱۰۵)۔

■ "قرقرہ: ایک قسم کا پرندہ۔"

یہ معنی بالکل ناکافی ہیں۔ قرقرہ، عربی میں قہقہے کو کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں کبوتر کے غٹرغوں کرنے، اونٹ کے بلبلانے اور پیٹ کے گُوگُو کرنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی میں قرقرہ اُس افریقی صحرائی مرغی کو بھی کہا جاتا ہے جو انگریزی میں guinea fowl اور ہمارے ہاں چینی مرغی کہلاتی ہے۔ اِس نام میں چینی، چین سے نسبت نہیں ہے بلکہ اِس کا مطلب چتکبری ہے۔ اِسی سبب سے پنجاب میں یہ تیتری کے نام سے

مشہور ہے۔لیکن اردو میں قرقرا' کلنگ سے مشابہ'ایک آبی پرندہ ہے جو بگلے سے بڑا اور سارس سے چھوٹا ہوتا ہے۔آواز کی مناسبت سے اِسے کونج کہا جا سکتا ہے۔

■ ''کاچھ کرنا:بد لحاظی کرنا' جماع کرنا۔''

یہاں مرتّب نے نہایت غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔کاچھنا یا کاچھ کرنا' چھانٹنے' چننے یا چھاچھ سے مکھن اتارنے کے معنی دیتا ہے۔مصنّف نے دودھ سے کریم علیحدہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے:

''وہاں کریم اِس کا نام ہے کہ دودھ تھوڑی دیر رکھا رہے اور جب دُہنیت کا سفید اور لطیف حصّہ اوپر آجائے تو کاچھ کر الگ کر لیا جائے۔''(صفحہ ۲۴۴)۔

البتّہ کاچھ کے ایک معنی جانگھ کے بھی ہیں جس کی مناسبت سے ''کاچھ'' کو کاچھا یعنی جانگیہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس سے محاورہ ''کاچھ کھولنا'' بنا ہے جس کے معنی وہ ہیں جو چغتائی صاحب نے ''کاچھ کرنا'' کے لکھے ہیں ۔

■ ''کسنا:کھینچنا' تاننا' باندھنا' آزمانا' بندوق بھرنا۔''

یہ سب معنی بجا و درست لیکن مصنّف کا مقصد اِس جگہ ''کسنا'' مصدر سے نہیں ہے بلکہ اسم سے۔کسنا' دست بقچے کی طرح کی چیز ہے۔ یہ ایک گول کپڑا ہے جس کے چاروں طرف نیفہ بنا ہوتا ہے۔اِس میں ازار بند کی طرح ڈوری ڈال دیتے ہیں۔پھر اِس میں ضرورت کی اشیا رکھ کر ڈوری کس کر گرہ دے دی جاتی ہے جس سے یہ ایک پوٹلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔پاندان لانے لیجانے کے لیے بھی اِس پر کسنا چڑھا دیا جاتا تھا۔یہاں یہی کسنا مراد ہے چنانچہ:

''لکڑی کے خوان' اُن پر رنگین تیلیوں کا گنبد نما جھابا' اُس پر ایک سفید کپڑے کا کسنا جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا تھا...... اِس بندھن پر لاکھ لگا کر مہر بھی کردی جاتی تاکہ درمیان میں کسی کو تصرّف کا موقع نہ ملے۔''(صفحہ ۲۴۰)

- ''کشوری: ایک قسم کا پرندہ۔''

اِس پر حواشی کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے کہ یہ لفظ دراصل کستوری (بلکہ کستورے بصورت جمع) ہے جو پہلی اشاعتوں میں غلط چھپ گیا تھا۔ چغتائی صاحب نے نہ صرف متن میں اِس غلطی کی پیروی کی بلکہ فرہنگ میں بھی یہی مُہمل لفظ شامل کر دیا۔

- ''کھیل: بُھنے ہوئے چاول یا جوار یا مکئی کا وہ بُھنا ہوا دانا جو پھول گیا ہو۔''

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ''کھیل'' ایک عمومی لفظ ہے جو نہ صرف کھِلے ہوئے اناج کے لیے بلکہ بعض کیمیائی اشیا مثلاً سہاگہ اور پھٹکری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے تاہم خصوصیت کے ساتھ بھنی ہوئی جوار کو کھیلیں بھنی ہوئی مکئی کو پھُلے اور بُھنے ہوئے چاولوں کو مُرمُرے کہا جاتا ہے۔ جس تناظر میں مصنف نے یہ لفظ استعمال کیا ہے وہ شادی کی رسوم ہیں۔ اِن میں شکر یا بتاشوں کے ساتھ صرف جوار کی کھیلیں کام میں آتی تھیں۔

- ''گلتھی: اُبلے ہوئے نرم نرم چاول۔''

یہ صراحت ناکافی بلکہ گمراہ کن ہے۔ اِس سے جس کھانے کا تصور ہوتا ہے وہ پن بھتا ہے یعنی وہ ڈھیلے ڈھیلے چاول جن کو اُبالنے کے بعد پیچ نہ نکالی گئی ہو۔ گلتھی ایک لذیذ کھانا ہے جو مزعفر میں دودھ کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے اور اِس میں خشک میوے اضافہ کر دیے جاتے ہیں۔ گلتھی کی اہمیت متن کی اِس عبارت سے عیاں ہوتی ہے:

''نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک صاحبِ کمال باورچی صرف چاولوں کی گلتھی پکاتا مگر ایسی گلتھی جو شاہی دسترخوان کی رونق افزا رہ، وائے وقت کو نہایت مرغوب تھی اور شہر کے سارے رئیسوں کو اس کا ایک لقمہ مل جانے کی تمنا تھی۔'' (صفحہ ۲۱۱)

- ''گلگلے: ایک قسم کا بطور نذر پکوان۔''

گلگلوں کے لیے نذر کی شرط ناواجب ہے۔ یہ بغیر نذر مانے بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ ساون کی کڑھائیوں کے اہم پکوان گلگلے، پوریاں اور بڑے ہوا کرتے تھے۔ متن میں (صفحہ

۲۶۸) چونکہ نذر کے گُلگلوں کا ذکر آیا ہے اس لیے مرتب نے گُلگلوں کو نذر سے مخصوص کر دیا جو ناواجب ہے۔

■ ''گندہ: نجس ' ناپاک ' غلیظ ' بدبودار ' سڑا ہوا ' برا ' بد ' چڑچڑا ۔''

لفظ ''گندہ'' مصنف نے لباس کے ضمن میں استعمال کیا ہے:

''موسم اور آب و ہوا...... کا اثر...... یہ تھا کہ بجائے گندہ اور گراں کپڑوں کے سبک اور نازک کپڑے اختیار کیے گئے۔'' (صفحہ ۲۵۰)

قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں گُندہ (گاف مضموم) بمعنی موٹا اور دبیز ہے نہ با گاف مفتوح۔ متن میں اس پر باقاعدہ پیش لگائی گئی ہے۔ چغتائی صاحب نے اِسے گندہ کر کے اتنے معنی دینے کا خواہ مخواہ تردد کیا۔

■ ''گھٹیلا: گھات لگانے والا۔''

یہ معنی فاضل مرتب نے خدا جانے کہاں سے اخذ کیے ہیں۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہو چکا ہے چغتائی صاحب گھٹیلے جوتے کو ہر جگہ گھٹیلا لکھتے ہیں۔ اب فرہنگ میں انہوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا اور اس لفظ کو ایک مجہول معنی عطا کر دیے جو متن کے تناظر میں بالکل بے موقع ہیں۔

■ ''لچکا: جھٹکا ' ہچکولا ' موچ ' چک۔''

یہ معنی بالکل غیر متعلق ہیں۔ مصنف کی مراد گوٹے (کناری) کی ایک قسم سے ہے۔ گوٹے کی چوڑائی کے اعتبار سے اس کے مختلف نام ہوتے ہیں جیسے چھڑیاں ' لچکا ' ٹھپہ ' لپہ وغیرہ۔ متن میں اس کا استعمال اس عبارت میں ہوا ہے:

''یہ خوان پوش بڑی سرکاروں میں لازمی طور پر اطلس اور کمخواب یا زربفت کے ہوتے تھے اور کبھی فقط لچکا ٹانک دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا۔'' (صفحہ ۲۴۰)

■ ''لفافہ: حوصلہ ' ظرف ' ہمت ' رعب ' رعب داب ' لہجہ ' خوش لسانی ' لب ولہجہ ' قوت بیانی ' طاقت۔''

چغتائی صاحب نے بلاسبب اتنے الفاظ لکھنے کی زحمت کی ۔متن میں محاورہ'' لقلقہ باندھنا'' آیا ہے۔لق لق (لک لک) سارس کو کہتے ہیں اور اُس کی آواز لقلقہ کہلاتی ہے ۔جب یہ مل کر بولتے ہیں تو بہت شور ہوتا ہے۔اِس مسلسل قیں قیں کرنے کو''لقلقہ باندھنا'' کہا جاتا ہے۔مصنف نے رشتہ کرانے والی مشاطاؤں کی چرب زبانی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لڑکی کے ''حسن و جمال ٗناز و انداز اور خوبی و رعنائی کے بیان میں ایسے لقلقے باندھ دیتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہیں وہ کوہِ قاف کی پری یا شہزادی بدرمنیر ہے۔''(صفحہ۲۸۲)

ظاہر ہے کہ لقلقہ باندھنے کے معنی یہاں کسی کی توصیف میں رطب اللسان ہونے یا تعریفوں کے پُل باندھنے سے ہے۔

■ ''لوزات:شیرینیاں ۔''

لوز بادام کو کہتے ہیں ۔لوزات اِس کی جمع ہے جس کا اطلاق خشک میووں پر بھی ہوتا ہے۔لوزیات بے شک خشک میووں اور بالخصوص بادام سے تیار کردہ حلووں اور مٹھائیوں کو کہتے ہیں تاہم یہاں یہ مٹھائیاں مراد نہیں ہیں بلکہ اُن کی بَرفی کی مانند کٹی ہوئی متوازی الاضلاع شکل۔متن میں یہ لفظ یوں استعمال ہوا ہے:

''امجد علی شاہ کے زمانے میں یک بیک گڈی ایجاد ہوئی جس کی قطع لوزات کی سی ہوتی۔''(صفحہ ۱۷۶)۔

انگریزی ترجمے سے اِس کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جو یہ ہے:

"In the time of Amjad Ali Shah a paper kite named GUDDI was invented which was shaped like an upright diamond....."(page.131)-

■ ''مردنگ: ایک قسم کا شیشہ کا فانوس جس پر شمع کو روشن کر کے رکھ دیتے ہیں ۔''

چغتائی صاحب مردنگ کے اصلی معنی پسِ پشت ڈال کر اُس کے اضافی معنی دے رہے ہیں ۔بنیادی طور پر مردنگ ٗڈھولک کی قبیل سے تال کا معروف ساز ہے اور مصنف نے

اِنہی معنی میں استعمال کیا ہے:

''اِس کے بعد قدیم الایام ہی میں مردنگ نکلی جو غالباً سری کرشن جی کے زمانے میں موجود تھی اور اُن کی بانسری کے نغمے کیساتھ مردنگ کی گمک بھی جمنا کے کنارے برج کے جنگل میں سنی جاتی تھی۔ مردنگ کے بعد ترقی یہ ہوئی کہ پکھاوج بنی جو اعلیٰ موسیقی کا خوب ساتھ دیتی تھی۔''(صفحہ ۱۸۷)

چغتائی صاحب نے پکھاوج پر حاشیہ (۴۵۱) بھی دیا ہے تاہم فرہنگ میں مردنگ کوشیشے کا فانوس بتا رہے ہیں۔

- ''موگری: وہ آلہ جس سے زمین یا چھت کو ٹتے ہیں۔''

لفظ موگری بڑے وسیع معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ سب سے بڑی موگری وہ ہوتی ہے جو کسرت کرنے والے گھماتے ہیں اور چھوٹی وہ جس سے نوبت یا گھڑیال بجایا جاتا ہے۔ مصنف نے یہ لفظ اِنہی معنی میں استعمال کیا ہے چنانچہ:

''پہروں اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالوں پر موگریاں پڑتیں......''(صفحہ ۵۹)

- ''منکہر: ناگھ۔''

دراصل یہ لفظ مہکو (منہ+گھڑا) ہے اور کتاب میں کئی جگہ آیا ہے۔ اِس کے سیدھے سے معنی ''گھڑے کا منہ'' ہے۔ مثال کے طور پر:

''لوگ......ایک گھڑا باندھ دیتے ہیں۔ اُس کے مہکو پر جھلّی منڈھ کے......''(صفحہ ۱۷۱)

''اُن کے مہکوؤں پر عموماً سوہے کا کپڑا تاڑے سے بندھا ہوتا ہے اور جلوس میں اِن سب گھڑوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے......''(صفحہ ۳۸۴)

''جھجریاں بھی ویسی ہی نازک اور سبک ہیں۔ اِن کا پیٹ تو صراحیوں کے مثل ہوتا ہے مگر اِس کے اوپر بجائے گردن کے عوض ایک مہکو لگا دیا جاتا ہے۔''(صفحہ ۳۱۹)

ماگھ ایک ہندی مہینے کا نام ہے جس کا مہکو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

■ ناندا: گملا'' اور'' ناندے پتیلہ کی ایک قسم۔''

ناند (ناندا نہیں) کھلے ہوئے منہ کے اونڈے اور بڑے برتن کو کہتے ہیں جو اگلے زمانے میں بالٹیوں اور چھوٹے ٹبوں کا کام دیتا تھا۔ اِس قسم کے مٹی کے برتنوں سے گملوں کا کام بھی لیا جاسکتا تھا۔''ناند'' مونث ہے۔ اِس کی جمع ''نادیں'' آتی ہے ناندے نہیں۔مصنف نے یہ لفظ ٹھنڈے پانی کی فراہمی کے ضمن میں یوں استعمال کیا ہے:

''جست کی نازک صراحیاں موجود رہتیں اور وہ ناندوں میں شورہ اور پانی ڈال کے اُس میں پھرائی جاتیں۔'' (صفحہ ۲۲۵)

■ ''ہڑک: ایک قسم کا باجا' باؤلے کتے کا زہر اثر کرجانا اور کتے کی طرح بولنا اور کاٹنے کو دوڑنا۔''

یہاں چغتائی صاحب حسبِ معمول دو مختلف لفظوں کو خبط کر گئے ہیں۔باؤلے پن کے لیے لفظ ''ہڑک'' آتا ہے اِس کا پہلا حرف مفتوح یا مکسور اور دوسرا مفتوح ہے جب کہ باجے والے ''ہڑک'' کا حرفِ اوّل مضموم ہے اور حرفِ دوم مضموم اور مفتوح دونوں طرح آتا ہے۔یہاں باؤلے پن والی ہڑک کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔مصنف نے دوسرا لفظ استعمال کیا ہے۔ایک وضع کے اُگالدان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِن کی قطع کہاروں کی ہڑک یا مداری کی ڈگڈگی کی سی ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۳۱۰)۔

ہڑک ایک قسم کی ڈفلی ہے جو کہاروں سے مخصوص تھی۔ اِس کی شکل ریت گھڑی کے شیشے سے مشابہ تھی جس کے دونوں سروں پر جھلّی منڈھی ہوتی تھی۔جس طرح مداری ڈگڈگی بجا کر مجمع اکٹھا کرتا ہے اُسی طرح کہار ڈولی سے سواریاں چڑھانے اُتارنے اور اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے ہڑک سے کام لیتے تھے۔

چغتائی صاحب سے پہلے ''گذشتہ لکھنؤ'' کی کسی اشاعت میں فرہنگ کا وجود نہیں

تھا۔ اُنہوں نے اِس کا التزام کر کے ایک اچھا قدم اُٹھایا تھا لیکن اِس کا کیا علاج کہ اپنی لاپروائی سے موصوف نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ کتاب کے متن کو تو طاقِ نسیاں پر رکھا اور لغت کی کتابیں دیکھ کر جو بھی الٹ شلٹ معنی نظر آئے نقل کر ڈالے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اِن کی کچھ تک بھی بنتی ہے یا نہیں۔ حد یہ ہے کہ حاشیے میں ایک لفظ کی کچھ اور تشریح کی اور فرہنگ میں اُس کے کوئی اور معنی درج کر دیے۔ ''گھیتلا'' (جوتا) کی مثال اوپر درج ہو چکی ہے۔ ایسی ہی مثال لفظ ''کوکا'' کی ہے۔ فرہنگ میں اِس کے معنی یوں لکھے ہیں:

''کوکا: باریک کیل۔''

وہ بھول گئے کہ اِس سے پہلے وہ اِس پر حاشیہ دے آئے ہیں جو یوں ہے:

''(۲۵۲) کوکا (ہندی) جب ایک عورت اپنے مالک کے نومولود کو دودھ پلاتی ہے تو اُس کا اپنا حقیقی بچہ، دوسرے دودھ پینے والے بچے کا ''کوکا بھائی'' کہلاتا ہے۔''

یہ مندرجہ ذیل انگریزی حاشیے کا تقریباً لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے:

"Hindi KOKA.When a wet-nurse gave her milk to the infant of an employer,her own son became a KOKA brother to the child."

یہ ''کوکا'' دراصل ''کوکہ'' ہے اور ہندی نہیں ترکی ہے۔ یہ مخفف ہے کوکلتاش کا اور اِس کی آخری ''ہ'' مختفی ہے۔ اردو املا میں عموماً ''ہ'' اور ''الف'' میں فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور انگریزی میں تو دونوں کو حرف ''اے'' (a) سے لکھا جاتا ہے۔ چغتائی صاحب حاشیے کی منزل تو انگریزی کی مدد سے پار کر گئے۔ جب فرہنگ کا مرحلہ آیا تو اُنہوں نے کسی لغت میں لفظ ''کوکہ'' دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ ''کوکا'' دیکھا۔ وہاں لکھا تھا ''باریک کیل'' سو وہی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دی: چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مختصر یہ کہ اِس فرہنگ کی تیاری میں چغتائی صاحب نے جس فراخ روی اور بالادوی کا مظاہرہ کیا ہے اُس نے اِسے ایک چیستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہنا تو یہ بھی تھا کہ اُنہوں نے وہ بہت سے الفاظ، جن پر حاشیے نہیں دیے تھے، فرہنگ میں بھی فراموش کر دیے ہیں لیکن اب

اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔

(VII)

"۷۔"گذشتہ لکھنؤ" کا انگریزی ترجمہ ہرکورٹ اور فاخر حسین کی مشترک کوششوں کا نتیجہ ہے، جو لندن سے ۱۹۷۶ء میں طبع ہوا تھا۔ اِس ترجمے کے تعارف کو بھی آخر میں من وعن شامل کیا گیا ہے۔"

انگریزی ترجمہ ۱۹۷۶ء نہیں بلکہ ۱۹۷۵ء میں چھپا تھا۔

(VIII)

"۸۔شرر نے اپنی اِس کتاب میں لکھنؤ کے جس دور کو اپنا موضوع بنایا ہے، اِس سے متعلقہ جتنی تصاویر اِس وقت دستیاب ہیں، اُن کے حصول میں خاصی تگ و دو کرنا پڑی......الخ۔"

اِس اشاعت میں تین نقشوں کے علاوہ اٹھارہ تصاویر شامل ہیں ۔اِس سے قبل "گذشتہ لکھنؤ" کے صرف انگریزی ترجمے میں اِن چیزوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔وہاں تین نقشے اور بتیس تصویریں شائع کی گئی تھیں ۔اِن تصاویر میں بارہ ایسی ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ انگریزی ترجمے والی زائد تصاویر میں خود مصنّف کے علاوہ میر انیس کی تصویر بھی شامل ہے۔علاوہ ازیں جامع مسجد آصف الدّولہ اور لکھنؤ کے شاندار امام باڑوں کی تصویریں ہیں جن کی زیرِنظر اشاعت میں کمی محسوس ہوتی ہے۔انگریزی ترجمے والی تصاویر کی طباعت کا معیار بھی بہتر ہے غالباً اِس لیے کہ یہ کام انگلستان میں انجام پایا تھا۔

اِن تمام معروضات کی روشنی میں جو اختصار کی خواہش کے باوجود خاصی طویل ہو گئی ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ چغتائی صاحب نے "گذشتہ لکھنؤ" کی تدوین کی شکل میں ایک ایسا کام اپنے ذمہ لیا جس کو وہ نبھا نہ سکے۔یہ پتھر اُن کے دست وبازو کو دیکھتے ہوئے بھاری نکلا ۔خدا جانے اُنہوں نے اِس کام کا بیڑا کیا سوچ کر اُٹھایا تھا ۔قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی

غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ اِس اشاعت کے دیباچہ سے اِس معاملے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ:

"کسی شہر سے......جدّی تعلق کے علاوہ دیگر متنوع جہتوں میں ایک علمی یا موضوعی جہت بھی ہے اور راقم کی لکھنؤ کی تہذیبی میراث سے دلچسپی کا یہی سبب ہے اور اِس کی نوعیت بھی حادثاتی ہے۔"(دیباچہ،صفحہ ۱۱)

اِس دلچسپی کو جن حادثات سے مہمیز ہوئی وہ یہ ہیں:

۱۔ نصابی ضرورت سے لکھنوی دبستان ادب کا مطالعہ۔

۲۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) اور پھر ذخیرۂ اشپرنگر (مخزونہ برلن) نیز ایلیٹ کے نجی کاغذات (مخزونہ برٹش میوزیم لندن) سے شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کے بارے میں تازہ معلومات کا حصول جس کی بنیاد پر اُن کی کتاب "شاہانِ اودھ کے کتب خانے" وجود میں آئی جسے انجمن ترقّی اردو (کراچی) نے شائع کیا تھا۔

۳۔ آسٹریا کے قومی کتاب خانہ (ویانہ) میں واجد علی شاہ اختر اور اُن کی محلات کی سات مختلف تصانیف دیکھنے میں آئیں۔

ان میں سے چغتائی صاحب نے نواب آبادی جان بیگم ملقب بہ مشغلتہ السلطان کے نام شاہ کے خطوط کا مجموعہ "تاریخِ مشغلہ" کے عنوان سے ۱۹۸۴ء میں اور واجد علی شاہ اختر کی منظوم خودنوشت "حزنِ اختر" کے نام سے ۱۹۹۹ء میں لاہور سے شائع کیں۔

۴۔ ونڈسر کاسل کے کتب خانۂ شاہی میں انہیں واجد علی شاہ کی تصنیف "عشق نامہ" کا نادر مصوّر مخطوطہ دیکھنے اور اُس کی نقل لینے کا موقع ملا۔

اور اِس "سلسلۂ حادثات" کی آخری کڑی کا تذکرہ وہ بدیں الفاظ کرتے ہیں:

"گذشتہ تقریباً تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے 'لکھنؤ سے اپنے علمی و ادبی اور کسی حد تک 'حادثاتی' تعلق ہی کا یہ ثمر ہے کہ عبدالحلیم شرر کی معرکہ آرا تصنیف بہ عنوان 'گذشتہ لکھنؤ' کی

اشاعتِ نو کا قرعۂ فال راقم ہی کے نام نکلا۔'' (دیباچہ، صفحہ ۱۵)

چغتائی صاحب کی ''گذشتہ لکھنؤ'' کی اشاعتِ نو میں دکھائی گئی کارگزاری سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِس موضوع کے ساتھ اُن کا تین دہائیوں پر محیط تعلق، حادثاتی زیادہ اور علمی و ادبی اعتبار سے ''کسی حد تک'' تھا۔

حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ کسی تہذیب و تمدّن کا موضوع ایک بحرِ ناپیدا کنار کی حیثیت رکھتا ہے اور فہرست ہائے کتب، منظوم خودنوشتوں اور مجموعہ ہائے مکاتیب کے بل بوتے پر اِس بحر کی شناوری ممکن نہیں ہوتی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' کو معرکہ آرا تصنیف کہنا لفظ کا غلط استعمال ہے ۔ اِس کو مقبول اور قابلِ قدر تصنیف کہنا چاہیے۔

مضمون کے اختتام سے قبل اِس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' کی زیرِ نظر اشاعت میں کتابت کی اغلاط کی تعداد نسبتاً کم ہے اور یہ اچھی علامت ہے ۔ اِس پر مجھے مشفق خواجہ مرحوم کا ایک خط یاد آیا جو اُنہوں نے سنگِ میل پبلی کیشنز (لاہور) ہی کی شائع کردہ ''سرمایۂ اردو'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، اُس کے مرتّب پروفیسر صدّیق جاوید صاحب کے نام ۳۔جولائی سنہ ۲۰۰۰ء کو لکھا تھا۔ اس کے ایک اقتباس پر میں اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں:

''یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ کسی نے سنگ میل والوں سے کہا: ''آپ کی کتابوں میں کتابت کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں ۔''

اُنہوں نے جواب دیا : ''تو کیا ہوا، کتابیں تو پھر بھی بِک جاتی ہیں۔'' حالانکہ اُنہیں کہنا چاہیے تھا: ''ہمارے بعض مصنّفین کی غلطیوں کے مقابلے پر کتابت کی غلطیاں پھر بھی کم ہوتی ہیں۔'' (''سویرا'' نمبر ۸۴، مئی جون ۲۰۰۶ء، صفحہ ۳۹۶)

☆☆☆☆☆